
اردو کی خواتین ناول نگار
نادیہ عنبر لودھی

اردو کی خواتین ناول نگار

مصنفہ

نادیہ عنبر لودھی

قلم کتاب ای پبلشرز
واٹس ایپ نمبر 03010487501

© جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

نام کتاب: اردو کی خواتین ناول نگار

مصنف: نادیہ عنبر لودھی

موضوع: تحقیق

تزئین و آرائش: محمد عثمان ذوالفقار

کتابت: ابنِ قلم

برقی اشاعت: اگست 2026ء

سوشل میڈیا انچارج: ماہ رخ شہریار

ناشر: قلم کتاب ای پبلشرز

قلم کتاب ای پبلشرز

واٹس ایپ نمبر 03010487501

رو میں ہے رخشِ عمر

نام: نادیہ عنبر لودھی

خاندانی نام: نادیہ لودھی

تخلص: عنبر

والد: فاروق خان لودھی

والدہ: شمیم لودھی

بہن بھائی: ایک بہن ، دو بھائی

اولاد: الوینہ، حارث، ہادی، ولی

تاریخ پیدائش: 23 جولائی، 1980، اسلام آباد، پاکستان

تعلیم: میٹرک فضائیہ اسکول کورنگی کریک کراچی

ایم اے: پنجاب یونی ورسٹی لاہور

ملازمت: خبریں مانچسٹر یوکے 2016 تا حال

تصنیفات: شب غم کا جوش (کالمز)، تعاقب میں خواب (شاعری)، گمراہ اور دوسری کہانیاں، معاصر اردو شاعرات حصہ اول

زیر طبع کتب: خاک دان (ناول)، معاصر اردو شاعرات حصہ دوم، اے حقیقت منتظر (تصوف)

رہائش: پنجاب ہاسنگ سوسائٹی، راولپنڈی، پاکستان

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلق دام خیال ہے

انتساب

میری دادی جان حسن آراء اور کنزئی کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	رو میں ہے رخش عمر	4
2	نادیہ عنبر لودھی کی ادبی جہات	12
3	پیش لفظ	14
4	اردو ناول نگاری کا فن	15
5	اے آر خاتون	17
6	اکبری بیگم	21
7	الطاف فاطمہ	23
8	آمنہ ابوالحسن	28
9	آمنہ مفتی	34
10	بانو قدسیہ	43
11	جمیلہ ہاشمی	48
12	جیلانی بانو	52
13	بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری	55
14	حمیدہ جبین	58
15	حنا جمشید	60

16	خالدہ حسین	61
17	خدیجہ مستور	65
18	ڈاکٹر خدیجہ ممتاز	70
19	رضیہ بٹ	72
20	رضیہ سجاد ظہیر	76
21	رضیہ فصیح احمد	81
22	زاہدہ حنا	86
23	زبیدہ خاتون	87
24	زلیخا حسین	89
25	سارہ ابوبکر	92
26	سلمی اعوان	93
27	سلمی صدیقی	95
28	سلمی کنول	97
29	ڈاکٹر سیمیں رخ	99
30	شاہدہ دلاور	101
31	صادقہ نواب سحر	105
32	صالحہ عابد حسین	110
33	صغری مہدی	114
34	صغرا ہمایوں مرزا	116
35	طاہرہ اقبال	118
36	عصمت چغتائی	121

37	عفت موہانی	124
38	کنول بہزاد	132
39	نثار عزیز بٹ	135
40	نذر سجاد حیدر	136
41	قرالعین حیدر	138
42	واجدہ تبسم	141
43	وحیدہ نسیم	146
44	سوانحی اشارات	149

حروف تہجی کے لحاظ سے ناول نگار خواتین کے نام کا اندراج کیا گیا ہے جن کا اظہاریہ اردو ہے۔

اپنا آپ مٹا ڈالا اس بیکار سی خواہش میں
میرا ذکر کتابوں میں ہو ، میرا ذکر رسالوں میں

شبنم شکیل

نادیہ عنبر لودھی کی ادبی جہات

اردو ادب کی تاریخ میں کتنے ہی لوگ ڈوبے اور ابھرے۔ کچھ تو ایسے ہیں جنھوں نے ایک آدھ تخلیق سے سب کو چونکا دیا۔ کچھ پانچ دس نگارشات کے بعد کسی اور طرف مڑ گئے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ادبی منظر نامے میں نہ صرف اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی ادبی شخصیت مصفی ومجلی ہوتی چلی گئی۔ان کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ادب کی مختلف اصناف میں لکھنے والے مختلف راستے اپناتے ہیں۔ کچھ نے تاریخی عوامل کو تخلیقات کے لیے چنا کچھ نے مارکسی ازم کی پیروی کی کچھ دیہی پس منظر سے جڑے ہوئے ہیں تو کچھ شہری زندگی کی پیچیدگیوں سے اپنا رشتہ استوار رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تن من دھن سے ادب کی ترویج میں لگے ہوئے ہیں۔

ان ہی میں ایک نام نادیہ عنبر لودھی کا بھی ہے۔ وہ ایسی روشن لکیر بن کر ابھرتی ہے جو اپنی تخلیقات سے زندگی کے مختلف اور متنوع دھاروں کو نہ صرف سمیٹتی ہے بلکہ انہیں منور بھی کرتی چلی جاتی ہے۔اس مادی دور میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد یقیناً بہت کم ہے۔

محترمہ نادیہ عنبر لودھی صاحبہ سے میرا تعارف تقریبا دس برس قبل ہوا میں نے انہیں خاموشی سے

اپنے حجرے میں علم و ادب کی شمع جلائے ہوئے دیکھا ہے نہ صلے کے آرزو نہ ستائش کی تمنا بس خاموشی سے وہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے شاعری کی، کالمز لکھے، فکشن میں ایک ناول لکھا اس کے بعد پاپولر فکشن لکھا اور اب تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے۔اس کتاب اردو کی ناول نگار خواتین کے لیے محترمہ کو مبارک باد، میں اور میرا ادارہ محترمہ کے ادبی سفر کے لئے دعا گو ہیں اللہ تعالی انہیں مزید ہمت اور طاقت دے اور وہ اسی طرح علم و ادب کی شمع جلائے رکھیں۔

دعا گو

جاوید خان

بانی و چیف ایڈیٹر خبریں مانچسٹر۔یو کے

+4407775767108

پیش لفظ

ناول نگار خواتین کی تحقیق کے دوران اس انکشاف نے حیران کر دیا کہ خالدہ حسین کے بعد شہر اقتدار میں ایک بھی ناول نگار خاتون نہیں ہے زیادہ تعداد شاعرات کی ہے پھر افسانہ نگار خواتین ہیں۔ پاکستان کی کل ادبی صورت حال کا جائزہ لیں تو علم ہوتا ہے کہ ان افسانہ نگار میں سے بھی ایک تعداد تو کہانی نویس خواتین کی ہے جو اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کو افسانہ سمجھتی ہیں۔ اس وقت تو ذکر ناول نگاری کا ہے تو مایوس کن صورت حال ہے ادب عالیہ کا تقابل اگر پاپولر فکشن سے کیا جائے تو ڈائجسٹوں میں لکھنے والی خواتین کی تعداد کافی زیادہ جو ناولٹ لکھ رہی ہیں۔ کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ یہ ڈائجسٹ رائیٹر کہانی لکھتے ہوئے ڈائجسٹ کی پالیسی کو مدنظر رکھتی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے انکی کہانیاں ایک مخصوص ایجنڈے کو لے کر چلتی ہیں سلسلہ وار چھپنے والے ناولز کا بھی یہ ہی معیار ہے۔ یہ ایجنڈا ہے سستی جذباتیت، خوبصورت امیر ہیرو، مظلوم ہیروئین، گھریلو ناچاقیاں اور کہانی کا اچھا انجام یعنی کہ حقیقت سے فرار ڈائجسٹ کی یہ مسالہ دار کہانیاں بھی سوشل میڈیا ٹک ٹاک ریلیز، فیس بک ریلیز ، انسٹا ریلیز اور یوٹیوب شارٹس کے سامنے مدھم سی پڑ گئی ہیں۔

آج تو یہ حال ہے کہ بزرگوں کے جن ہاتھوں میں تسبیح ہونی چاہیے ان میں سمارٹ فون ہے۔ نیند کے حصول کے لیے رات کو مطالعے کی عادت دن کو اخبار پڑھنے کی عادت قصہ پارینہ ہوئے۔ سماج کس طرف جا رہا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ اردو زبان و ادب کی خواتین ناول نگاروں کو کتاب میں جمع کرنے کی میری کوشش ہوگی۔ انشااللہ۔

نادیہ عنبر لودھی

03215678089

اردو ناول نگاری کا فن

خواتین کی ناول نگاری کی ابتدا19 ویں صدی کی آخری دہائی میں ہوئی ۔انیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک خواتین کی تحریر کردہ کئی ناول منظر عام پر آ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی سیاسی سماجی اور تعلیمی حالت زوال پذیر تھی تعلیم کے فقدان کی بنا پر جہالت کی ساری برائیاں مسلم معاشرے کا حصہ بن چکی تھی۔ خیر وہ تو اب بھی ہیں۔اب تو اخلاقی گراوٹ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔تو ہم پرستی اور غلط رسم ورواج عام تھی اور ہیں۔عام مسلم خواتین کی حالت بہت ابتر تھی ۔سماج میں ان کی حیثیت ثانوی تھی۔تعلیم کو ان کے لیے ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔انہیں صرف تین بنیادی ضرورتیں کھانا، کپڑا اور مکان کا حق حاصل تھا اس سے زیادہ کی وہ حقدار نہیں سمجھی جاتی تھی ۔اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے انکی عملداری کہیں نظر نہیں آتی تھی ۔مولوی نذیر احمد نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھا کہ لڑکیوں کو بھی تعلیم و تربیت سے آشنا کیا جائے انہوں نے پہلا ناول 1869 میں **مرات العروس** لکھا۔ڈپٹی نذیر احمد کے بعد اصلاحی ناول لکھنے والوں میں علامہ راشد الخیری کا نام بہت اہم ہے۔راشد الخیری نے 1894 میں عشقیہ ناول **احسن و میمونہ** سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں تعلیم یافتہ خواتین کا ایسا طبقہ ابھر کے سامنے آیا جنھوں نے خواتین پر ہونے والے مظالم اور بے انصافیوں کے خلاف قلمی جہاد شروع کیا۔ایسے ادبی رسالے شائع ہونے لگے جو خواتین کے لیے مخصوص تھے ۔جن میں خواتین لکھا کرتی تھیں ان رسالوں کا صرف ایک مقصد تھا مستورات میں تعلیم عام کرنا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔رشیدہ النساء بیگم پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ناول لکھنے کی ابتدا کی یہ ناول **اصلاح النساء** کے نام سے 1881 میں لکھا گیا۔رشیدہ النساء بیگم کے

ناول اصلاح النساء کے بعد مولوی سراج الدین احمد کی بیگم نے ناول دکن کے عنوان سے رسالہ خاتون میں قسط وار شائع کیا ناول دکن میں جو کردار پیش کیے گئے۔ان کا ماحول معاشرتی اور مغربی تعلیم وتہذیب کے بہترین عناصر کا امتزاج تھا۔اس کے بعد محمدی بیگم اور پھر خواتین کی ایک فہرست ہے جنہوں نے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا ان میں اکبری بیگم،نذر سجاد حیدر،عباسی بیگم،صغرا ہمائیوں مرزا،الف زے حسن بیگم،بیگم شاہ نواز،ضیا بانو اور طیبہ بیگم کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشیدہ النساء ہیں۔وہ جنگِ آزادی سے چار سال قبل 1853 میں پٹنہ،صوبہ بہار میں پیدا ہوئیں۔1949 میں انتقال ہو گیا۔خواتین کے حوالے سے ان کے اصلاحی ناول مشہور ہوئے۔ انیسویں صدی میں شاید ہی کوئی مسلمان لڑکی اسکول جاتی ہوگی۔رشیدہ النساء نے گھر پر تعلیم حاصل کی۔

اے آر خاتون نے بھی گھر پر تعلیم حاصل کی۔انہوں نے تقسیم ہندوستان سے قبل ناول نگاری کا آغاز کیا۔اس کے بعد خواتین ناول نگاروں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

اے آر خاتون

اے آر خاتون کا اصل نام امت الرحمٰن خاتون تھا۔ وہ 1900 میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے انہیں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنے شوق اور جستجو سے گھر کے اندر رہتے ہوئے نہ صرف تعلیم مکمل کی بلکہ مضمون نگاری کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ عصمت میں شائع ہوتے رہے۔

1929 میں انہوں نے اپنا پہلا ناول شمع تحریر کیا جو اپنے دلکش انداز تحریر کی وجہ سے بے حد پسند کیا گیا۔ اس ناول نے اردو میں ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ شمع کے بعد ان کا دوسرا ناول تصویر تھا۔ یہ ناول بھی شمع کی طرح بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد تو اے آر خاتون کے ناولوں کی قطار لگ گئی۔ افشاں، فاکہہ، چشمہ، ہالا اور رومانہ ان کے ایسے ہی چند ناول ہیں جنہوں نے شائع ہوتے ہی دھوم مچا دی۔

افشاں وہ ناول تھا جس کی ڈرامائی تشکیل کا بہت شہرہ ہوا۔ اسی طرح شمع بھی مقبول ترین ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں ٹی وی ڈراموں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نشر ہونے کے اوقات میں سڑکیں سنسان ہو جایا کرتی تھیں۔ کیا عورتیں اور کیا مرد اے آر خاتون کی کہانیوں پر مبنی یہ ڈرامے سبھی میں یکساں مقبول تھے۔ ہندوستانی معاشرے کی جھلک دکھاتے ہوئے اے آر خاتون نے اپنے تمام ناولوں میں مقصدیت اور تعمیری پہلوؤں کو اہمیت دی ہے۔

اے آر خاتون کے ناولوں میں کہانی اور کردار میں یکسانیت سی پائی جاتی ہے تاہم ان ناولوں میں برصغیر کے مسلمان معاشرے کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی بنتی بگڑتی صورت حال صاف دکھائی دیتی ہے اور یہی ان کے ناولوں کا اختصاص بھی ہے اور مقبولیت کا سبب بھی۔

خاندان میں ریشہ دوانیاں، رشتہ داروں کی چپقلش اس طرح کی تمام الجھنوں کا ذکر اور انھیں سنوارنے کا طریقہ بہت سادگی سے بیان کیا ہے۔ دِلی اور لکھنو کی چشمک کا بھی خوب صورت انداز میں ذکر کرتی ہیں۔ چشمہ ناول کی ہیروئن کی والدہ کی شادی لکھنو میں ہوئی، لکھنو کی ایک خاتون شادی پر تبصرہ کرتی ہیں

ناول سے اقتباس:

'دلی میں رشتہ کرنے سے بہتر تھا پنجاب میں رشتہ کیا جائے۔'

'ادبی طور پر بھی لکھنو اور دلی کی چشمک مشہور ہے۔'

ناول ''افشاں'' سے اقتباس:

''پرانے خیالات کے شرفا میں اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ اگر خاندان میں لڑکے لڑکیاں موجود ہوں تو شادی بیاہ آپس میں کرتے ہیں پہلے زمانہ میں بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی نسبت ٹھہرادی جاتی تھی بلکہ ان کا وجود بھی نہیں ہوتا تھا اور بڑی بڑھیا اپنی رائے قائم کر دیتی تھی مگر زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اب لڑکے لڑکی کا عندیہ لے کر شادی کی جاتی ہے یا اس مسئلے پر تو کوئی بحث ہی نہیں کہ آئندہ نسلوں کے واسطے یہ طریقہ صحیح ہے یا غلط لیکن ایسے خاندانوں میں جہاں ابھی تک پردے کا رواج باقی ہے یہ دستور ایک حد تک اچھا ہے کیونکہ لڑکے لڑکیاں بچپن سے ایک ساتھ رہے ہوئے دیکھے بھالے ہوتے ہیں نہ ان کی شکل وصورت ایک دوسرے سے چھپی ہوئی ہوتی ہے نہ عادت واطوار پوشیدہ اگر ان کے بزرگ ذرا عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لیں تو ایسی شادیاں زیادہ تر کامیاب رہتی ہیں یہ بات دوسری ہے کہ لڑکا کانوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے اور لڑکی اندر ہی اندر گھلی جارہی ہے مگر ماں باپ اپنی خوشی اور خاندان کے لحاظ سے جبر وسختی سے کام لیتے ہیں کنبے رشتے والے قطع تعلق کرنے کو تیار ہوتے ہیں دوست احباب مجبور کرتے ہیں غرض چاروں طرف سے دباؤ ڈالا جاتا ہے اور زبردستی شادی کی جاتی ہے ایسے رشتے ناکام نہ ہوں تو تعجب ہے۔ سید صاحب کے خاندان میں بھی یہی دستور تھا انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بھی کنبے ہی میں کی اور اب پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی کا وقت آیا تو ہی اصول مدنظر رکھا۔''

اس پیراگراف میں رشتے ناطوں کے مروجہ اصول کس عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں۔ شمع، افشاں اور

تصویر ان کے مشہور و مقبول ناول ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے قائل تھی اور انہی خیالات کا پرچار وہ اپنے ناولوں میں بھی کرتی تھیں۔

ناول ''افشاں'' سے اقتباس:

''افشاں کے چچا اور بڑی پھپھی کی لڑکیاں کالجوں میں پڑھتی تھیں ان کے اوپر بے جا پابندیاں اور سختیاں نہیں تھیں وہ خاصی آزاد بھی تھیں اور اپنے آپ کو نئے زمانے کے سانچے میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ پردہ ضرور کرتی تھیں لیکن ان کو اپنی سہیلیوں ہم جولیوں سے ملنے کی اجازت تھی وہ برقع اوڑھ کے کھیل تماشوں اور سینما دیکھنے بھی جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے افشاں اپنی چھوٹی پھوپھی اور دادی کے نقش قدم پر چلتی تھی اس نے اپنی عمر میں شاید ایک یا دو فلمیں دیکھی تھیں۔ وہ بھی جب کبھی اس کے چچا اور پھپھی کی لڑکیاں دلی آتی تھیں تو اس کو مجبور کر کے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں اس نے خود کبھی کسی کھیل تماشے میں جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی اس کے چچا اور بڑی پھپھی کبھی مہینہ پندرہ دن کو اپنے ہاں بلانا چاہتے تو بغیر دادی پھپھی کے نہیں جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اپنے باپ کے ہاں آٹھ دس روز سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔''

ان ناولوں نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اتر پردیش (یعنی یوپی) کے شہروں میں اونچے متوسط، متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلمان اشرافیہ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو جس عمدگی اور خوبصورتی سے لکھ کر محفوظ کیا وہ اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ناول ''ثمر'' سے اقتباس:

''ثمر نے غربت کے آغوش میں آنکھ کھولی۔ فلاکت کے سائے میں پرورش پائی نہ تو اس کے پاس پیسہ تھا کہ وہ اپنے لیے شوہر خرید لیتی اور نہ اسے کوئی ایسا مرد ملا جو اپنے تئیں مفت اس کے حوالے کر دیتا یا از رائے احسان و کرم اس کا پیٹ پالتا اور تن ڈھانکتا جینا اسے ہر حال میں تھا اور سوائے عصمت و ناموس کے اور کوئی چیز اس کے پاس تھی نہیں چنانچہ وہ اسی متاع عزیز کو لے کے رنج و بدبختی کے بازار میں پہنچ گئی۔ جہاں شرافت کے ڈاکوں نے اس کے بہت تھوڑے دام لگائے اور اس نے نفرت و کراہت کے ساتھ اونے پونے اسے ان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آہ بیچاری ثمر

اس کی ان ساری مصیبتوں کی جڑ اس کا حسن و جمال تھا۔اس لیے کہ اگر وہ بدصورت ہوتی تو اسے کوئی نہ کوئی ایسا مرد ضرور مل جاتا جو اس پہ رحم کھا کر اپنی شفقت و مہربانی کی پناہ میں لے لیتا لیکن حسن ایک ایسا دل پسند سودا ہے جس کا مالک چاہے وہ کتنا ہی محتاج کیوں نہ ہو مول تول کے بغیر لوگوں سے ایک پائی وصول نہیں کر سکتا یہی اور صرف یہی ایک وجہ تھی جس نے اس بدبخت نوجوان لڑکی کو تمام مردوں کا دشمن بنا دیا اس نے قسم کھالی کہ اپنے حسن و جمال کو نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز اور امیروں کا مخزن ہے انتقام کا ذریعہ بنا کر ان سے اپنے اس پاک دامنی کا بدلہ لے گی۔اس نے اپنا یہ عہد پورا کیا اور نہایت خلوص کے ساتھ پورا کیا چنانچہ وہ لوگوں سے گھل مل کر باتیں کرتی لیکن ان کی محبت کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیتی۔ان کے ذہنی اور مادی سرمائے پر چھاپے مارتی اور مطلق افسوس نہ کرتی۔اپنے قدموں میں پڑے ہوئے رونے والوں کے آنسوں کو مسرور نگاہوں سے دیکھتی۔“

اس مرکزی کردار ثمر کو ناول کے انجام میں توبہ تائب کے بعد جنت مکانی دکھایا گیا ہے۔

خالص دہلوی لب و لہجے سے مزین سے اے آر خاتون کے ناولوں کی زبان برجستہ اور رواں ہے۔آج تو یہ عالم ہے کہ اہل زبان کے بچوں کی بھی شین قاف درست نہیں ہے۔

ایک پردہ نشین عورت اپنے کرداروں کی داخلی اور اس پر اثر انداز ہونے والے خارجی اثرات کی بنت، اپنے ماحول اور اپنی روایات کے پس منظر میں اس عمدگی سے بنتی ہے کہ انسانی فطرت کے خیر و شر کے پہلو نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔کچھ ظاہری، کچھ باطنی رخ محبتوں اور نفرتوں میں گندھے سامنے آتے ہیں کہ ہر کردار ذہن پر ایک بھرپور نقش چھوڑتا ہے۔

وہ ناول کو منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے کرداروں کا تزکیہ نفس بھی کرتی ہیں۔قیام پاکستان کے بعد اے آر خاتون پاکستان چلی آئیں جہاں 24 فروری 1965 کو لاہور میں ان کا انتقال ہوگیا۔

☆☆☆☆

اکبری بیگم

اکبری بیگم(والدہ افضل علی)اردو کی ابتدائی اہم خواتین ناول نگاروں میں سے ایک ہیں۔اکبری بیگم قرۃ العین حیدر کی والدہ نذرسجاد حید کی پھپھوتھی۔انہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں اصلاحی ناول لکھے۔ ان کا سب سے مشہور ناول ''گودڑ کا لال'' ہے جو 1907 میں شائع ہوا۔جبکہ'' گلدستہ محبت''ان کی پہلی تصنیف تھی۔

1857ء کے بعد ہندوستانی معاشرہ نی تبدیلیوں اور مسائل سے دوچار تھا۔اس وقت ہندوستانی عورتوں میں بالخصوص مسلم خواتین میں تعلیم کا رواج بہت کم تھا بلکہ خواتین فرسودہ خیالات وعقائداور غلط رسم ورواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھیں تحریک سرسیداورڈپٹی نذیراحمد کی کوششوں کے بعدخواتین میں تحصیل علم اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔خواتین کی ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوئی۔اس زمانے میں سماج اور معاشرے کے خوف سے خواتین اپنا نام بھی ظاہر نہیں کرتی تھیں اوراپنی تخلیقات فرضی ناموں سے شائع کراتی تھیں۔ڈپٹی نذیر کے اصلاح خواتین کے لیے لکھے گئے ناولوں کے بعد کچھ خواتین نے ان کی آواز پر لبیک کہا اوران کے پیغام کو ہر جگہ پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہوگئیں۔ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں کے نام بہت معروف نہیں لیکن انھوں نے ناول نگاری کے استحکام میں اہم رول ادا کیا۔

معاشرے کی تشکیل مرداورعورت کے باہمی تعاون سے ہوتی ہےاورکوئی بھی معاشرہ اس وقت تک فلاحی اورترقی یافتہ معاشرہ نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواتین کو یکساں حقوق میں میسر نہ ہو۔

یہی برصغیر کے معاشرے کی اس وقت کی سب سے بڑی خامی تھی کہ خواتین ناخواندہ تھیں لڑکوں کوسکول بھیجا جاتا تھااورلڑکیوں کوسکول بھیجنے کی طرف معاشرے کا رجحان نہیں تھا ابتدائی ناول نگارخواتین نے لڑکیوں کی تعلیم کواہمیت دی اوراپنے ناولوں کے ذریعے پڑھنے والوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ بچیوں کی تعلیم پر زور

دیں بچیوں کو بھی بچوں کے ساتھ سکول بھیجیں اب لڑکیوں کے لیے الگ سکول تو اس وقت بنائے نہیں جا سکتے تھے اس لیے اس بات پر زور دیا گیا تو وہ لڑکوں کے ساتھ سکول میں جا کے پڑھیں یعنی مخلوط تعلیمی نظام کی حمایت میں ناول کہانیاں اور افسانے لکھے گئے جس پر معاشرے کی طرف سے مزاحمت دیکھنے میں آئی ۔دوسری طرف ناول نگار خواتین نے پردے کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے پردہ اتارنے کا نعرہ بھی لگایا جس پر مذہبی ذہنیت کے حامل افراد ان کے خلاف ہو گئے ۔اس وقت کے فرسودہ معاشرے میں اس قسم کے خیالات انتہائی باغیانہ تصور کیے جاتے تھے لہذا مزاحمت تو لازمی تھی ۔ناول ''گودڑ کا لال'' میں بھی مصنفہ نے مخلوط تعلیمی نظام کے تحت علم حاصل کرنے پر ترغیب دی ہے ۔اس وقت ہندوستان میں لڑکیوں کا اسکول جانا ناممکنات میں سے تھا۔ معاشرے کی اصلاح کے پیش نظر ناول کے تمام کردار اصلاحی نقطہ نظر لیے ہوئے ہیں ۔اولاد کی تربیت اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے ۔اس کے علاوہ حفظان صحت کے اصول، بے جوڑ شادی کے نتائج، کثرت ازواج، خواتین کے حقوق، معاشرے میں رائج غلط رسومات، بے جا پابندیاں اور اوہام پرستی وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے ۔ان سب تعلیمات کا مقصد صرف اور صرف ایک تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات پیدا کی جائے ۔لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر حقوق دیے جائیں عورت کو بھی انسان کا درجہ دیا جائے نہ کہ اسے زرخرید غلام سمجھا جائے ۔ناول کا مقصد خواتین میں شعور پیدا کرنا تھا اور وہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہا۔اکبری بیگم 1928ء میں وفات پا گئی ۔

☆☆☆☆☆

الطاف فاطمہ

الطاف فاطمہ کا تعلق ریاست پٹیالہ سے ہے۔ ان کے والد کا نام فضل امین تھا۔ الطاف فاطمہ لکھنو میں 1927 میں پیدا ہوئیں۔ اسی جگہ انھوں نے ہوش سنبھالا اور لکھنو کی تہذیبی روایات کا اثر ان کی شخصیت پر پڑا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئیں۔ یہاں لیڈی میکلیگن کالج سے بی ایڈ کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور میں اردو کی استاد مقرر ہوئیں۔ اور اسی کالج سے شعبہِ اردو کی سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

ان کے ناولوں میں

نشانِ محفل (1960ء)

دستک نہ دو (1964ء)

چلتا مسافر (1980ء)

خواب گر (2008ء)

چلتا مسافر الطاف فاطمہ کا نمائندہ ناول ہے۔ چلتا مسافر ناول میں سفر ہی سفر بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم سے پہلے کا سفر اور تقسیم کے بعد کا سفر۔

یہ دونوں سفر گھر اور بے گھری سے جڑے ہیں۔

اس ناول میں مصنفہ ایک جگہ پہ لکھتی ہیں:

''ہر شخص عالم سفر میں ہے کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے۔ ہر مسافر کو اپنی منزل کا پتہ ہے۔ یقین ہے کہ وہ کہاں ہوں گے۔ اور کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ ان کی منزلیں اور منزلوں

کے نشان گم ہو گئے۔''

ایک اور جگہ پہ لکھتی ہیں:

''روح ایک چلتا مسافر ہے ایک ایسا مسافر جس سے عدم اور وجود کے درمیان سفر درپیش ہے۔سفر درپیش رہتا ہے سفر میں کتنے موڑ آتے ہیں۔کتنے نشیبوں سے گزر کر منزلوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔یہ تمام مرحلے روح اور بدن مل کر طے کرتے ہیں۔''

اس ناول میں مزمل کی روح کو بھی ایک سفر درپیش تھا۔مزمل بہاری مسلک کی علامت بن کر تحریک پاکستان کے ساتھ سفر کرتا رہا اور مشرقی پاکستان جا پہنچا یہ روح اور بدن کا سفر تھا مگر کبھی منزل حاصل نہ کر سکا ۔سفر جاری رہا مگر سفر کا انداز تبدیل ہو گیا 1987 میں شائع ہونے والے اس ناول میں تقسیم برصغیر کو پس منظر میں رکھ کر کہانی بیان کی گئی ہے۔پٹنہ کے ایک ایسے خاندان کی کہانی اس ناول میں بیان کی گئی ہے جو کہ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ ہجرت کر گیا مگر جب مکتی باہنی کی تحریک چلی اردو اور بنگالی زبانوں کا مسئلہ بڑھا تو اس خاندان کو بہت مشکلات برداشت کرنا پڑی ناول کے جو کردار ہیں۔ان کی نفسیاتی جذباتی اور معاشرتی مسائل کا تذکرہ مصنفہ نے اس ناول میں کیا ہے۔

ناول کی ابتدا اس لوگ گیت سے کی گئی ہے:

''تنگ سی ڈبیا ڈب ڈب کرے
تنگ سی ڈبیا ڈب ڈب کرے
چلتا مسافر گر گر پڑے''

ناول پڑھ کے مصنفہ کے اسلوب کے دلکشی اور رعنائی ہمارے سامنے آتی ہے۔الطاف فاطمہ کو زبان و بیان پر مکمل عبور اور مہارت حاصل تھی۔ان کی تحریر کسی متحرک فلم سے کم نہ تھی۔ تمام کردار خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے متحرک رہتے ہیں۔پڑھنے والا ان سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ان کی جزیات نگاری میں بھی ایک حسن اور بانک پن کا سا احساس ہوتا ہے۔الطاف فاطمہ کے تمام کردار زندہ اور متحرک ہیں

زندگی سے بھرپور ہیں اور اس ناول کی کامیابی کی دلیل بھی یہی زندہ اور متحرک کردار سمجھے جاتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کے نسوانی کردار جاندار کردار ہیں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''مزمل جب بھابھی کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے پاس پڑی شال اپنے اوپر کھینچ لی اس لیے کہ یہ بی بی کا لنچ ٹائم تھا اور وہ اس کو فیڈ دے رہی تھی اس کے قدموں کی چاپ سن کر انہوں نے اپنے پرس میں سے کبھی کا پڑھا ہوا خط نکال لیا اور بڑے انہماک سے پڑھنا شروع کر دیا۔''

الطاف فاطمہ کے اس ناول چلتا مسافر میں ہمیں جذبات نگاری کی بھی بڑی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔ مثلا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''خالہ ماں کا جی بے حد بھرا ہوا تھا ان کا جی چاہ رہا تھا خوب چیخیں مار مار کر روئیں اور کہیں کہ کیا بتاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا منہ کدھر کالا کروں ایک بات تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ مرنے والے مر جاتے ہیں اور اپنے دلدار دوسروں کے لیے کیوں چھوڑ جاتے ہیں۔''

چلتا مسافر میں ہمیں تجسیم نگاری کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں مثلا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

'' نصیباں نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں حسرتوں کے مزار تھے اور خوف ہی خوف تھا بے کس اور بے آسرا وجود پتے کی طرح لرز رہا تھا۔''

چلتا مسافر میں ہمیں جہاں قدرتی مناظر کی منظر کشی طرز معاشرت رسوم رواج کے مرقعے بھی ملتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کا ناول خواب گر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بعض انسانوں کے اندر ایسی سچائی اور صداقت کا نور ہوتا ہے، جو اپنے قریب آنے والوں کے اندر کے اندھیروں کو بھی اجالوں میں بدل دیتا ہے، ان کی سچائی شراب کے سرور کی طرح ہمارے اندر اترتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قرب بند زخموں کا منہ کھول دیتا ہے۔ درد وغم، گلے شکوے کا سارا زہر، مضر مواد کی طرح اس دہانہ زخم کے راستے بہ کر سچائی اور اخلاص کی راہ کھول دیتا ہے۔ اور آج مجھے احساس ہوا ہے کہ غم زدہ اور پریشان حال کس واسطے ولیوں اور درویشوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کا قرب ان کی طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔''

مشہور زمانہ ناول جس پر پی ٹی وی نے ڈرامہ بھی بنایا'' دستک نہ دو'' ہے۔دستک نہ دو ناول جب چھپا تو اسے بے حد پذیرائی ملی۔ناول سے ایک اقتباس:

''کون جانے یہ سب کچھ میں نے رات کی تنہائیوں میں دبے قدموں نیند میں درآنے والے کسی خواب میں دیکھا ہو۔خواب جو ہمارے شعور اور لاشعور کی پگڈنڈیاں پر انجانے مسافروں کی طرح سفر کرتے ہیں۔جن کی سرعت اور توانائی ،لمحات اور وقت کی گرفت سے آزاد ہوتی ہے اور پھر کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا لمحہ کوئی ہسرائی ہوئی آن اس طرح پکڑ میں آجاتے ہیں۔جیسے یہ لمحہ اور آن اس وقت میری گرفت میں ہے۔جب ہی تو بعض اوقات انسان بعض لوگوں کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ لے یہ تو وہی جانی پہچانی شکل ہے،جس کی تلاش مجھے ہمیشہ سے تھی۔''

''**نشان منزل**''ان کا پہلا ناول ہے جو 1960 میں چھپا۔

''**نشان منزل**'' سے اقتباس:

''چیڑھ کے سائے تلے ایک چپٹے سے سیاہ پتھر پر وہ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ایک گہری سانس لی اور سوچنے لگا،تو تم میرے ساتھ اس لیے آئی تھیں۔ٹھیک ہے،کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔واہ میاں ایبک ! شاگرد ہو تو تمہارے جیسا۔کاش میں بھی تمہارے ہی جیسا ہوتا۔لیکن میری پشت پر صدیوں کی ثقافت اور تمدن کا بوجھ لدا ہوا ہے۔مرنجاں مرنج خیالات کا ایک جم غفیر ہے کہ دل و دماغ کو کچلے ہوئے ہے۔خیر دیکھیں کہ تم کیا تیر مارتے ہو۔ہم سے تو کچھ ہونے کا نہیں۔ہمیں تو سکون اور سلامت روی نے مارا ہے۔زہر ہم نہ پیئں گے۔دماغ کا توازن ہمارا برقرار رہے گا۔بس ایک میٹھی میٹھی آنچ ہوگی کہ سوخت کرے گی اور تم ہو گے کہ بصد رنگ تمنا ہو گے۔چلو تمہیں ہی مبارک ہو۔

مگر میں کیا کروں، بتاؤ۔ان ہاتھوں نے انسانی خون سے رنگین ہونا نہیں سیکھا ہے۔ان انگلیوں نے کسی زندہ جسم کو ضرر نہیں پہنچایا ہے۔اس دل و دماغ میں انسانی جان کی قیمت کا بڑا تصور بٹھایا گیا ہے۔اس زبان کو شیریں گفتاری کی تلقین کی گئی ہے۔اس نے سر بازار کسی کی پگڑی نہیں اچھالی ہے۔میاں ہماری تو تربیت ہی غلط ہے۔ہم واقعی مذاق اڑانے کے قابل ہیں۔

مگر یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ یہ وقت بھی مجھ پر اس وقت پڑا ہے جب مجھے اپنا کوئی ہمدرد نظر نہیں آتا۔ ایک دھندلا سا خیال ایک موہوم سی شبیہ اس کے تصور کے پردے پر ابھری اور فوراً ہی مٹ گئی۔''

الطاف فاطمہ کے ناولز، ان کا فکشن، ان کے افسانے لکھنو کی تہذیب, قیام پاکستان سقوط ڈھاکہ کے پس منظر کے ساتھ ساتھ حال کے عکاس بھی ہیں۔

الطاف فاطمہ نے شادی نہیں کی تھی اپنی مرحومہ بہن کے بچوں کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ آپ انتیس نومبر 2018 کو لاہور میں وفات پا گئیں اور میانی صاحب قبرستان میں مدفون ہوئی۔

☆☆☆☆☆

آمنہ ابوالحسن

حیدر آباد کی فکشن نگار خواتین میں آمنہ ابوالحسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔آمنہ حیدر آباد کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں 10 مئی 1941 کو پیدا ہوئیں۔آپ کے نانا اپنے وقت کے جید عالم تصور کیے جاتے تھے۔آمنہ ابوالحسن کے والد کا نام ابوالحسن سید علی تھا۔آمنہ ابوالحسن کے بچپن میں ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔اپنے والد کے زیرِ سایہ انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ان کے والد ابوالحسن سید علی مرحوم نامور قانون داں اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بھی تھے۔مصنفہ کی شادی دورانِ تعلیم ہی جناب مصطفیٰ علی اکبر صاحب سے ہوئی جو آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔آمنہ ابوالحسن 9 اپریل 2005 کو سرائے فانی سے عالم لافانی کو منتقل ہو گئیں۔آمنہ ابوالحسن کو بچپن ہی سے کہانی لکھنے کا شوق تھا۔ان کی پہلی کہانی ''ننھی کلی'' کے عنوان سے بچوں کے لیے شائع ہونے والے رسالے میں چھپی تھی، اس وقت موصوفہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔کہانی شائع ہونے کے بعد ان کے قلم میں خود اعتمادی آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تخلیقات یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آنے لگیں۔انہوں نے متعدد ناول لکھے جنھیں اردو ادب میں بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر **سیاہ سرخ سفید، تم کون ہو، واپسی، مہک، یادش بخیر** وغیرہ۔

آمنہ ابوالحسن کا سب سے پہلا ناول ''سیاہ سرخ سفید'' 1968 میں نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول 224 صفحات پر مشتمل ایک رومانی ناول ہے۔ان کا دوسرا ناول ''تم کون ہو'' 1974 میں نیشنل پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدر آباد سے شائع ہوا یہ ناول 164 صفحات پر مشتمل

ایک معاشرتی ناول ہے۔ان کا ایک اور ناول ''واپسی'' 1981ء میں موڈرن پبلشنگ ہاوس، گول مارکٹ سے شائع ہوا۔ ''یادش بخیر'' 1994ء میں موڈرن پبلشنگ ہاوس، دریا گنج، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ناول ''یادش بخیر'' میں قدیم تہذیب اور جدید دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے ناول میں کہیں کہیں خود کلامی سے کام لیا ہے اور اس کے وسیلے سے کرداروں کے افکار و تصورات کی ترجمانی کی ہے۔

ناول ''سیاہ سرخ سفید'' سے ایک ایک اقتباس:

''انکار اور اقرار کے درمیان ٹھوکریں کھاتے کھاتے میں تھک گئی ہوں، میری نڈھال زندگی تمہاری وسیع حیثیت تمہاری بلندیوں پر ایک حرف ہے، تم نے مجھے زندگی سے آشنا کیا تھا لو اب اپنی دی ہوئی زندگی بھی مجھ سے لے لو میرا لمس تو تمہارا حق ہے۔''

اس نے پیار سے اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھا پھر وہ بڑی بے فکری کے ساتھ اوپر چڑھنے لگی۔

''میری محبت کا ریشم تار تار ہو چکا ہے، میں اب اسے دوبارہ نہیں بن سکتی۔''

نشیب میں ناگنوں کی طرح لہراتی، گھومتی ہوئی، اڑی ترچھی پگڈنڈیوں نے نشاط کو حیرت سے دیکھا۔

''اس وقت آئی ہو اس وقت۔''

''وقت زندگی کے لیے اہمیت رکھتا ہے، موت کے لیے نہیں۔'' نشاط بڑبڑائی۔

حتی کہ وہ کافی اونچائی پر پہنچ گئی پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے اسکوٹر کی واضح قریب آتی ہوئی آواز سنی۔

چند ہی ساعتوں کے بعد فرخ اور الطاف بوکھلائے ہوئے دوڑتے نظر آئے۔ دونوں کی تیز تیز آوازیں ہوا کے دوش پر سوار میرے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

''وہ یہاں بھی نہیں۔''

''اسے مجھے لٹادو الطاف، خدا کے لیے۔''

فرخ کی رندی ہوئی آواز آئی۔

''میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں دوست۔''

'' وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

'' فرخ میرا یقین کرو۔''

''یقین کیا اس وقت۔''

''پھر تم مجھے دھوکہ نہیں دے رہے ہو۔''

''الطاف میں تمہیں کس طرح سمجھاں، فرخ کس طرح۔''

دونوں گرتے پڑتے راستوں اور رکاوٹوں کو الانگتے پھلانگتے بڑے چلے آرہے تھے۔

نشاط کے قدم تیز ہو گئے۔''

''تم کون ہو'' ناول کے شروع میں ایک مضمون ہے جس میں آمنہ ابوالحسن کہتی ہیں:

''لوگ کہتے ہیں لکھنا بہت مشکل ہے اور بولنا بہت آسان لیکن میرے لیے لکھنا بہت آسان ہے، بولتے رہنا ذرا مشکل بولتے وقت الفاظ اکثر میرے ذہن اور دہن سے غائب ہو جاتے ہیں مگر لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا میرے اندر کوئی دفینہ ہے جو ہمیشہ اپنا منہ پوری فراخ دلی سے کھول دیتا ہے کہ لوگ جتنا چاہو لے لو بے دری خرچ کر لو میں کبھی ختم ہونے والا نہیں میں تمہارا منبع ہوں تمہاری شخصیت کا سر چشمہ تمہارے محسوسات کا خزانہ تشکیل الفاظ میرے اندرون سے ترش ترش کر ابھرنے لگتے ہیں۔ میرے اظہار کی اوک لبالب لبریز ہو جاتی ہے۔تو جو فخر و غرور طاقت و عزم محسوس ہوتا ہے اور ٹھیک ایسے لمحوں میں مجھے حیات اور کائنات اشد ضروری محسوس ہوتے ہیں جیسے میں کبھی حیات اور کائنات سے بچھڑ نہیں سکتی، الگ اور جدا نہیں رہ سکتی جیسے میں خود ان کے جسم و جاں سے گلے ملی صدیوں زندہ اور باحیات رہوں گی، اس حساس جذبے کی طرح جس کی دنیا کو ازل سے ابد تک ضرورت ہوتی ہے۔''

آمنہ اپنے ناول کو ایک سوال کے طور پر پیش کر رہی ہیں اور کہتی ہیں جوابات تو بہت ہو سکتے ہیں مگر یہ

سوال صحیح جواب چاہتا ہے۔

ناول سے اقتباس:

''جب تک روئے زمین پر ایسی لڑکیاں موجود ہیں جنہیں جنت کے سکھوں اور دوزخ کے دکھوں سے زیادہ مرد کی فکروں کی طلب ہے مرد کی ضرورت ہے۔تب تک زیست کے ہونٹوں سے مٹھاس حاصل کرنے کی بجائے زمانے کے نشیب وفراز ،عرفان والہام کی تمنا بھی کس لیے کہ انسان ایسے جہان اورعشرت زندگی کے لیے ہی وجود میں آیا ہے اور دنیا کوئی خانقاہ نہیں۔ جہاں کا ہرمرد، ہرجگہ کا ہرمرد وزن لازمی طور پر راہب ہو،آثار زندگی اور شوق حیات سے بے بہرہ۔اب تک انیسہ اورنعیم کا تصادم مصلحتوں کا شکار تھا مگر عائشہ کی رخصتی کے بعد یہ ٹکراؤ کھلے عام ہونے لگا۔ نعیم نے اب انیسہ کو بھی اپنے انتقام کی زد پہ رکھ لیا اور انیسہ نے بھی ضد پکڑ لی لہذا دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے رہے۔ایک دوسرے کی نفی کرنے میں ہی اپنی مضبوطی سمجھنے لگے۔نعیم اور اپنے بچوں سے بے فکر اپنا ایک راستہ بنا چکی تھی۔اسے اپنی اسی شخصیت کی چاٹ پڑ چکی تھی۔ جو حاکم اورخود پسند تھی جواب کبھی محکوم بننے کے قابل نہ رہی تھی کہ جس طرح قاتل کو پھر خونی کے لیے پیاس آتی ہے۔خون خوار کو وحشت و درندگی ہی راس آتی ہے۔آدم خور کو خون کے سوا پھر کوئی اور ذائقہ نہیں جچتا اسی طرح انیسہ کو بھی صرف نعیم اوراس کا گھر ہی نہ چاہیے تھا بلکہ وہ دنیا جہاں پر وہ حکمرانی کر سکے۔''

تیسرے ناول واپسی کے پیش لفظ میں آمنہ ابوالحسن لکھتی ہیں:

''ہمیشہ دوسروں کو تولتے رہنے کے بجائے خود کو تولنا وہ طاقتور اور بے بہا عمل ہے جو ذات کو کائنات بنا سکتا ہے۔''

دیکھا جائے تو حقیقت بھی یہی ہے اکثر لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کی ذات کی نفی سے اپنا اثبات چاہتے ہیں جو کہ حقیقت میں ممکن نہیں ہوتا لیکن کیا کیجئے ایسے لوگ خوش فہمی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جہاں وہ خود کو افلاطون سمجھتے ہیں ناول ''واپسی'' تانیثیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔اس کا ایک پیراگراف ملاحظہ

ہو۔

'' اس رات میں پھر مارے ہیبت کے سو نہ سکی تھی مگر میری بے خوابی میں ، میں نے ایک شخص سے سمجھ بوجھ کر محبت کی تھی اور دوسرے سے لاعلمی میں مگر میری یہ دونوں محبتیں سچی تھیں ۔اپنے صداقت میں کہیں بھی متزلزل یا کھوٹی نہیں لیکن ان سے بھی طاقتور اب میرا وہ حصہ ہو چکا تھا جو مامتا کہلاتا تھا لہذا میں نے شہریار سے کہا میری پروین کے لیے کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈو شہریار ان تمام درمیانی واقعات کو کافی دن گزر چکے تھے اور پروین اب اپنی آخری تعلیمی سال میں تھی کہ ایسے میں اچانک ایمن کو باہر جانا پڑ گیا۔ایک نیا مرحلہ اٹھ کھڑا ہوا ایمن جانا نہ چاہتا تھا مگر اس کا جانا ضروری تھا۔ جب خاصی تگ و کے بعد جانا طے ہی ہو گیا تو میرے پاس آیا اور بولا کیا تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو؟ میں سوچ میں پڑ گئی ایمن نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے!'' ''چل رہی ہو کیا؟''

منشا ہوا تب میں نے بد دلی سے کہا ''نہیں تم اور دلشاد ہو آ ۔''

''میں پروین کو تنہا چھوڑ کر کیسے چل سکتی ہوں ۔''

وہ لمحہ بھر سوچتا رہا اور بولا ''ٹھیک ہے ۔''

اور اپنا سامان سفر درست کرنے لگا دلشاد باہر جانے کے خیال سے حد سے زیادہ خوش تھی۔ بڑے جوش وخروش سے روانگی کے تمام میں مصروف تھی پروین بھی ایمن کو رخصت کرنے کے لیے آ چکی تھی ۔''

ہمارے معاشرے میں عورت جب ماں بنتی ہے تو اپنے سارے جذبات واحساسات کا گلا گھونٹ دیتی ہے اپنی اولاد کے لیے خود کو قربان کر دیتی ہے اور اس پیرا گراف میں بھی ہم ایک ایسے ہی ماں دکھائی دیتی ہے جس نے اپنے جذبات کا گلا اپنے اولاد کے لیے گھونٹ دیا اور اپنے دل پر صبر کا پتھر رکھ لیا ہے۔

''یادش بخیر'' ناول کے پیش لفظ میں آمنہ کہتی ہے۔

'' وہ روشنی جسے تہذیب نفس کہتے ہیں کہیں سے ڈھونڈ کے لا بڑا اندھیرا ہے۔''

اس ناول میں مصنفہ نے جابجا خود کلامی سے کام لیا ہے۔

ناول سے ایک اقتباس:

’’ نظام میں اور ان میں یہ مشابہ ضرور تھا کہ نظام کی طرح صرف سانسوں کے تسلسل کو ہی حیات مکمل نہیں مانتے تھے شکیل بلکہ سانسوں کی سازگاری کو اصل حیات جانتے تھے عمومیت سے بالاخصوصیت کا مجموعہ تھے وہ انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں جیسمیر اور اجے پور کے چاندنی میں شراب اور ریگستانوں کا انوکھا حسن بھی یاد آ جاتا تھا۔صنم کو وہاں کے اونٹوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کا کہا تو اثر جو جرس کارواں کی طرح دور تک پھیلتا ہے، شکیل کے مزاج سے بے حد مناسبت رکھتا تھا۔حالانکہ قافلہ سالار نہیں تھے شکیل پھر بھی قافلے کا حصہ ضرور تھے اس مفرح مشروب جیسے جس کا پہلا ہی گھونٹ تھکن کا تکدر دور کر دیتا زبان کو لذت آشنا کر دیتا ہے۔

’’شکیل۔شکیل۔شکیل‘‘

صنم نے آہستہ آہستہ انہیں یوں پکارا جیسے لوری بچوں کو پکارتی ہے اور پکارتے پکارتے اس لوری کی غنایت میں خود بھی ضم، مدغم، سدھ، بدھ بھول کر گہری پرسکون نیند کے حوالے ہوگئی۔‘‘

آمنہ ابوالحسن نو اپریل 2005 کو انتقال کر گئی۔

☆☆☆☆☆

آمنہ مفتی

آمنہ مفتی کا تعلق لاہور سے ہے۔ ستر کی دہائی میں پیدا ہونے والی آمنہ مفتی اپنی نثر نگاری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے ناولز یہ ہیں:

جراتِ رندانہ

آخری زمانہ

پانی مر رہا ہے

آمنہ مفتی نے صحافت میں ایم اے کر رکھا ہے آمنہ مفتی پڑھاتی بھی ہیں۔ جامعہ پنجاب شعبہ صحافت میں سنہ 2017 سے فلم سکرپٹ کی وزٹنگ ٹیچر ہیں۔

آمنہ مفتی ڈرامہ نگار، کالم نگار، ناول نگار اور کہانی کار ہیں۔ ان کی وجہ شہرت ان کے لکھے ڈرامے ہیں۔ وہ بی بی سی اردو پر کالم بھی لکھتی ہیں۔

آمنہ مفتی صاحبہ کا پہلا ناول ''**جرات رندانہ**'' ہے۔ جو 2015 میں شائع ہوا تھا۔

جراتِ رندانہ آمنہ مفتی کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک نیم مفلوج (پولیو زدہ) نوجوان کی کہانی ہے جو زندگی اور اس سے منسلک معاشرتی اقدار کو شکست دینے کے لیے ہمت سے مقابلہ کرتا ہے۔ یہ مخصوص طبقے کی محرومی اور خود غرضی کا قصہ ہے جس کے بیان میں آمنہ مفتی نے کہیں بھی کرداروں کو ان کے طے کیے گئے دائروں سے باہر نہیں جانے دیا اور نہ ہی انھیں اپنا دستِ نگر رکھا ہے۔

یہ ہی ان کے اسلوب کی خوبی ہے کہ وہ سادگی میں روانی کو رواں دواں رکھتی ہیں۔ بیان کی خوبی ان کے ایک ناول ''**آخری زمانہ**'' میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

2011 میں ناول ''آخری زمانہ'' شائع ہوا۔ بہت ہی ضخیم سا ناول ہے۔تقریبا 600 صفحات ہیں۔

ناول سے اقتباس:

''واپسی پر علی نسبتا خاموش تھے۔ثمن آدھے سر کے درد کی شکایت کر رہی تھی اور راحیلہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی۔

'' راحیلہ تم آگے آجاؤ۔میری آنکھوں میں دھوپ چبھ رہی ہے۔''چڑھتی سورج کی کرنیں چکاچوندسی پیدا کر رہی تھی۔''

''آپ سن گلاسز لگا لیں۔'' راحیلہ نے مشورہ دیا۔وہ قطعا اپنی جگہ چھوڑنے کے موڈ میں نہ تھی۔

''بی بی جی کبھی اگلی سیٹ پہ نہیں بیٹھتی تھی انہیں ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ سب لوگ گھر سے خاص انہیں کچلنے نکلے ہیں۔''

'' ہٹو میرے سر میں درد ہے گلاسز سے تمہیں پتہ ہے اور بڑھ جائے گا علی پلیز ذرا ادھر سائیڈ پہ گاڑی روک دو کہ ہم اپنی سیٹیں ایکسچینج کر لیں۔''

'' اوکے بھابھی۔''

اگلی سیٹ پہ بیٹھ کے راحیلہ پر انکشاف ہوا کہ اس کی تمام تر بیزاری کے باوجود ثمن اور علی اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں جلد یا بدیر اسے ہار ماننا ہی پڑے گی ثمن پیچھے جاتے ہی فل فور سو ہوگئی اور علی نے 80 کی دہائی کے رومینٹک گانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لگانے شروع کر دیے راحیلہ خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تیری زلفوں کی نرم چھاں میں گزرنے پاتی
تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ رنج وغم کی سیاہی جو دل پہ چھائی ہے
تیری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

مگر یہ ہو نہ سکا

اور اب یہ عالم ہے

تو نہیں تیرا غم تیری جستجو بھی نہیں

گزر رہی ہے کچھ ایسے زندگی

جیسے اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

اُف کتنی اداس نظم ہے''۔علی نے کہا ''ہاں ساحر کی ہے۔''

'' ہوگی۔''

''اچھا یہ جولڑ کا خالد تھا دولہا۔یہ بھی سر بتار ہے تھے ایکس مجاہد تھا۔''

'مجاہد یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا حاضر سروس یا ریٹائرڈ مجاہد یہ کوئی اصطلاحات نہیں ہیں جہاد کسی کی نوکری نہیں ہے یہ تو عشق ہے فلم میں ہیرو کیسی جاندار اداکاری کرتے ہیں۔لوگ دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں مگر سین شوٹ ہوتے ہی تم اپنے گھر ہم اپنے گھر اور اس فلم میں یہ ہیرو اور وہ ہیروئن اور اس فلم میں وہ ہیرو اور یہ ہیروئین مگر حقیقت میں یہ نہیں ہوتا اور ہاں ایک اور بات فلم کا اختتام ہوتا ہے اور سب کچھ درست ہو جاتا ہے ولن اپنے کردہ اور لاکردہ گناہوں کی معافی مانگ لیتا ہے نوکر کی شادی نوکرانی سے ہو جاتی ہے ڈیڈ کی شادی بوا جی سے ہو جاتی ہے حتی کہ لان میں رہنے والے پرندے بھی ویلنٹائن ڈے مناتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور پھر وہ خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں مگر حقیقت میں یہ نہیں ہوتا عشق کا انجام اچھا نہیں ہوتا عشق ایک راستہ ہے۔منزل نہیں تو جناب آپ لوگ کرتے ہیں ایک ایسی جنگ جس کا حکم ملتا ہے اور یہ جنگ آج زید کے خلاف ہے تو کل بکر کے خلاف۔جو برا ہے وہ بے حد برا ہے اور انجام کار یہ ایک فاتح ایک مفتوح آپ کی جنگ حساب کے سوال ہوتی ہیں یا شاید کوئی خود ساختہ مساوات یہ جہاد جو ہے نا اس کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔کوئی بھی خوشی خوشی نہیں رہتا۔کیونکہ جہاد کے بعد اور منزلیں ہیں بے شمار درجے ہیں عشق کے متدراج کی طرح جنگ ختم ہو جاتی ہے۔جہاد ختم نہیں ہوتا اسے ختم نہیں کیا جا سکتا"

علی ذکر کر کے پچھتایا ہے۔

" مگر راحیلہ آپ ہمارے اس قدر خلاف کیوں ہیں؟"

"میں آپ کے خلاف نہیں میں صرف اپنی آزادرائے کا اظہار کر رہی ہوں اور میں دعوؤں کے حق میں بھی نہیں ہوں خالد کے بھی۔ یہ سب کچھ مس لیڈ ہو رہے ہیں اور اگر میں کچھ کہوں گی تو کوئی سنے گا نہیں کیونکہ سب خود کو افلاطون سمجھتے ہیں۔ راحیلہ نے کہا۔

"اگر یہی آپ کے لیے کہا جائے‘‘

" کیا مطلب "؟

"مطلب یہ کہ کیا ضروری ہے کہ جو کچھ اپ سوچ رہی ہیں وہی درست ہو۔ بہت ممکن ہے کہ آپ بھی مس لیڈ ہو جو لٹریچر آپ نے پڑھا جن لوگوں سے آپ کا تبادلہ خیال رہتا ہے ممکن ہے ان کا اثر ہو آپ اتنی بڑی تو نہیں کہ پوری دنیا کے خیالات کی نفی کر سکیں علی نے بڑی ہمت سے کہا

"اچھا خیال ہے"

"لیکن لٹریچر تو میں نے وہی پڑھا جو اس ملک میں آ سکتا ہے اور تبادلہ خیال بھی انہی لوگوں سے ہوا جو وہی زبان بولتے ہیں جو سب سننا چاہتے ہیں یہ قطعا میرے اپنے خیالات ہیں اور یہ مسئلہ یہی ہے ہم بہت سے لوگوں کو چھوٹا سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا پروفائل زوردار نہیں ہوتا بڑی بڑی مونچھیں، پہلوانوں والا ڈیل ڈول اور خاندانی بیک گرانڈ موٹی ڈگریاں جو پبلک سکول انہی جیسے لوگوں میں بانٹتے ہیں مجھ جیسی لڑکی کچھ بھی کہنے کے لیے قطعا موجود نہیں اس لیے مجھے پھوپھو کی طرح ٹیکوزیاں اور کشن کور سنوارنے چاہیے، ہے نا" راحیلہ برا مان گئی۔

" نہیں میرا مقصد یہ تھا اگر آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں تو کسی پلیٹ فارم سے کہیں یوں گھریلو گفتگو کو تلخ کیے رکھنا برامت مانیے گا یہ میرا ذاتی خیال ہے"

" گھریلو گفتگو، آپ کی خیال میں گفتگو کی قسمیں ہوتی ہیں حالات حاضرہ کی گفتگو فقط اخبار کے دفتر میں کی جائے اور گھر میں یہ آپ کا شوبزم ہے اور کچھ نہیں آپ لوگ بھی گھروں میں ہی بیٹھ کر نہایت ثقیل گفتگو کرتے ہیں مگر آپ کا مقصد ہے کہ یہ گفتگو نسوانی نہیں ہے۔ جیسے وہ کچھ

لوگ جیسے وہ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ لکھائی زنانہ ہے۔ یہ مردانہ ہے گویا لکھائی نہ ہوگئی۔سویٹر ہوگئی زنانہ،مردانہ بچگانہ راحیلہ کا دماغ پلٹا۔"

"میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ "

"پھر آپ کا کیا مقصد تھا؟"

گھریلو گفتگو اور غیر گھریلو گفتگو سے یہ کوئی کھانا تو نہیں ہوٹل کا کھانا اور گھر کا کھانا۔ واہ آئندہ یہ بھی ایک صنف بن جائے گی۔اس لڑکی کو گھریلو گفتگو کرنا آتی ہے اور اس کی گھریلو گفتگو خراب ہے۔ پھر گرامر بھی ترتیب دینی پڑے گی اور ہوتے ہوتے آپ کے حسب منشا دو ملک دو بالکل الگ خانوں میں بٹ جائے گی جیسے آپ نے عورت کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔گھریلو عورت اور بازارو عورت‘‘

"فارگاڈ سیک راحیلہ آپ تو بات کو کہیں اور لے گئی۔چلیں مجاہد کبھی ایکس مجاہد نہیں ہوتا تو آپ کا یہ ڈرائیور مجاہد ہے"؟

"ہاں مگر بات یہ ہے کہ اس بیچارے کو مجاہدین نے بھی نہیں اپنایا۔ان کے معیار بھی بڑے سخت ہیں۔ ہر ایک للو پنجو کو جہاد پر نہیں بھیجا جاتا یہ خالد تو ہمیشہ کا لائی لگ ہے اس کو کیا پتہ جہاد کیا ہوتا ہے؟ وہ تو شاید کسی نے کہا ہوگا کہ چل تو یوں ہی ہیکڑی جمانے کو چل دیا ہوگا بڑا افسادی ہے۔وہ تو پولیس طرح دے گی ورنہ اس نے ایک دفعہ خوب بلوا کرایا تھا اوقاف کی پراپرٹی تباہ کر دی تھی۔ ادھر ایک مندر تھا شہر میں اسی کے اکسانے پر توڑا گیا۔پھر یہ پاگل پن کا دورہ ڈال کے بیٹھ گیا تھا یہ تو اتنا بے وقوف ہے۔بچپن میں کسی بچے کی باتوں میں آ کر یہاں گھر سے پیسے اٹھا کر ایک چٹی سی تلوار لے آیا تھا اور وہ آدمی اتنا چاکو دا تھا اور اسے میں نے ڈرایا تو بھاگ گیا اپنے ننھیال تو بس یہ ایسا ہی ہے جس نے جس طرف لگایا چل پڑا یہ مجاہد نہیں ہے"

" کم آن راحیلہ اب آپ افسانوی باتیں کر رہی ہیں ایک آدمی ٹریننگ لے کر آیا ہے۔ اس کے خیالات بھی وہی ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں۔وہ مجاہد نہیں ہم لوگ باقاعدہ انرول فوجی ہیں۔ ایک مسلمان ملک کی فوج آپ ہمیں بھی مجاہد نہیں مانتی پھر مجاہد کون ہے۔آپ کے ذہن میں تراشا

ہوا کوئی ہیرو یا مجاہد کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں"۔

علی نے کہا غالبا وہ دشمن کے دیے ہوئے ایجنڈے سے منحرف ہو گیا۔

" پھر وہی ذہنیت بھئی آپ نے کچھ لوگ چنے انہیں تربیت دی اپنے مقاصد کے لیے انہیں استعمال کیا اور ان پر ایک ٹیگ لگا دیا مجاہدین تو آپ کے کہنے سے وہ مجاہدین تو نہیں ہو گئے ۔اصلاحات وقت کے ساتھ بدلی جا سکتی ہیں۔مگر نماز ہمیشہ نماز ہی رہے گی زکوۃ ہمیشہ زکوۃ ہی رہے گی خیرات بھی ایک نیک عمل ہے مگر وہ زکوۃ کا نعم البدل نہیں ہے کل کو آپ کہیں گے کہ ڈائیٹنگ روزہ ہے اور سوشل ورک زکوۃ ہے۔تو میں تو نہیں مانوں گی آپ کی بات"۔ راحیلہ ہٹیلے لہجے میں بولی علی خاموش ہو گیا راحیلہ نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا اور گنگنانے لگی۔

" مگر آپ کی باتیں اپنی نفی خود ہی کرتی ہیں۔ابھی اپ کہہ رہی تھیں کہ مجاہدین کے معیار بہت سخت ہوتے ہیں گویا آپ نہیں مانتی ہیں ظاہر ہے وہ ایک قوت ہیں ایک بڑی گوریلا قوت"

" مگر اس سب کا تعلق جہاد سے جوڑ کر آپ لوگوں نے برا کیا دادو جیسے پیارے لوگ انوالو ہو گئے یہ لوگ خواب دیکھنے والے لوگ ہیں انہیں نائٹ میر نہیں دکھانا چاہیے"

کیسا عمدہ تجزیہ ہے استعماری قوتوں نے نام نہاد جہاد کے نام پر جس طرح سے ہمارے ملک پاکستان کے افواج،عوام اور عام شہریوں کو گمراہ کیا ہے اس کی عمدہ مثال اس ناول کا یہ پیراگراف ہے جو کہ باب نمبر 44 میں سے لیا گیا ہے اس ناول میں آمنہ مفتی صاحبہ نے پاکستان کی تاریخ کے مکروہ چہرے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو کہ ایک بہت اچھی کوشش ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ان کے ناول ’’پانی مر رہا ہے‘‘ نے اپنے اسلوب، کہانی اور انداز بیاں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کی۔ان کا ناول ’’پانی مر رہا ہے‘‘ ایک ایسی کہانی ہے جس میں ہماری مٹی کی باس بھی ہے اور ہمارے مرتے دریاوں کا عکس بھی۔اس میں قیامت کی وہ نشانیاں ہیں جو قیامت گزر جانے کے بعد ہی نظر آتی ہیں۔

زہر اور شہد کا ذائقہ لیے اس ناول کو پڑھ کر آپ اپنے ماحول، اردگرد پھرتے انسانوں اور چرند پرند کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ناول سے اقتباس:

"تبت میں ایک جھیل ہے مان سرور جو کوہ کیلاش سے نکلتی ہے اس جھیل سے دریائے سندھ نکلتا ہے تبت لداخ شمال مغربی سرحدی صوبے سے گزرتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور سندھ سے گزرتا ہوا بحیرہ عرب میں گر جاتا ہے اس دوران اس میں بہت سے دریا گرتے ہیں ان دریاں انجانے وہ کیا کیا کہتے"

ایک اور جگہ ناول میں وہ لکھتی ہیں

"ملکہ مکھی کو تخلیق کا جنون تھا اور سارا چھتا اس کی تخلیق کی بقا کے لیے سرگرم تھا یہ تو صرف انسانوں میں ہوتا ہے کہ نو مہینے تخلیق کی سولی پہ چڑھنے کے بعد سارا شہد، سارے انڈے، بچے مرد لے جاتا ہے اور عورت خالی چھتے کی طرح ویران رہ جاتی ہے اس کا تو نام بھی بچے کے ساتھ نہیں لگتا خیر انسان تو یہاں اس زخیرے میں قدم رکھ ہی نہیں سکتا تھا فرش پر گھاس میں چوہوں کے بل تھے اور پانی کی کھالوں میں گو ہیں تیر رہی تھیں ننھی ننھی مچھلیاں نہری پانی کے ساتھ بہتی چلی آتی تھیں اورانہی کے ساتھ ایک بوڑھا کچھوا جوئی رابطہ نہریں کھودنے اور دریاں کے سوکھ جانے سے دربدر ہو گیا تھا یہاں آ گیا تھا۔ اس کچھوے کی عمر 100 سال سے اوپر ہو گی یہ ان کچھووں میں سے تھا جنہوں نے اول اول انسانی خون چکھا۔ایسا ہے کہ پانی کے جانور سب کچھ کھاتے ہیں۔گھاس بھی , حشرات بھی، مرنے والے دوسرے جانور بھی اور دریا میں بہا دیے جانے والے مردہ انسان اور جانور بھی لیکن وہ جو طبعی موت مرتے ہیں ان کے بہائی ہوئی لاشیں سست اور بوڑھے جانور ہی کھاتے ہیں"

پیراگراف کے ابتدائی جملے کیا عمدہ تانیثی انداز لیے ہوئے ہیں اور بعد کے فقرے فطرت کے اصول بیان کرتے ہیں۔

ایک اور اقتباس ناول سے ملاحظہ ہو:

"صرف ایک پکار سنائی دے رہی تھی کہ بڑی نہر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور گاں میں پانی بھرنے

والا ہے پھر اس نے دیکھا کہ سرخ مائل مٹیالہ پانی کھیتوں کی منڈھیریں اجاڑتا کھڑی فصلوں کو گراتا جانوروں ٹریکٹروں اور درختوں کو اکھیڑتا ,رگیدتا اپنے ساتھ بہاتا ایک دیوار کی طرح چلا آ رہا ہے یہ بڑی نہر کا پانی نہیں ہوسکتا تھا ابھی وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا کہ اس نے گدلی آنکھوں والے جسیم کچھوے ک اپنی طرف بڑھتے دیکھا اس کی اس کی مہین انکھوں میں وہ بھوک تھی جو غار کے انسان کی آنکھ میں کسی چوپائے کو دیکھ کر ابھرتی تھی اگلے جانے کتنے روز اس نے انسانوں کو کھانا تھا یہ وہی کچھوا تھا جس نے پہلے پہل انسانی خون چکھا تھا کہنے والے کہتے ہیں کہ مٹیالے پانی کی وہ دیوار میاں اللہ یار کے ڈیرے کو بھی بہا کر لے گئی ہے اور اپنے پیچھے زرخیز مٹی کے تہہ چھوڑ گئی۔

کہنے والوں کے معلوم ہی نہیں کہ زلزلے سے پہلے مسز منظور جب غسل خانے گئی تو ان کی نظر جنوبی دیوار پر پڑی جس پہ سیلن سے روغن کی پٹریاں سے ابھر آئی تھیں شاید کوئی پائپ لیک کر گیا تھا وہ جو سالوں سے بول نہیں رہی تھی حلق کے بل چلائی اور اتنا چلائی کہ ان کی آواز عرفان صاحب کے تہ خانے میں تیرنے والے آبی جانوروں نے بھی سنی وہ ایک آواز پکارے جا رہی تھی۔

پانی مر رہا ہے

پانی مر رہا ہے

اس دیوار میں پانی مر رہا ہے"۔

موجودہ دور میں اردو ناول نگاروں کی کھیپ دنیا سے رخصت ہو چکی ہے لاہور میں الطاف فاطمہ کے بعد آمنہ مفتی اور شاہدہ دلاور اردو ناول لکھ رہی ہیں۔آمنہ مفتی نے اپنے سفر کا آغاز پاپولر فکشن سے کیا۔انہوں نے پاپولر فکشن میں ڈائجسٹوں میں کہانی لکھی اور پھر اس کے بعد انہوں نے ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری کی۔اسلام آباد میں دیکھا جائے تو خالدہ حسین کے بعد آپ کو کوئی ناول نگار خاتون نظر نہیں آتی۔میرا تعلق بھی جڑواں شہروں سے ہے تو میرا ناول خاکدان اشاعت کے مراحل میں ہے اسی طرح کراچی میں آپ دیکھیں تو مایوسی ہے۔یہ میں نے آپ کو تین بڑے شہروں کی صورتحال بتائی ہے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد خواتین ناول نگاروں نے اس میدان میں بہت کام کیا۔لیکن اب افسانہ نگاری اور مضمون نگاری تو ہو رہی ہے

آمنہ مفتی اردو زبان میں ناول اور ٹیلی ویژن سیریل لکھتی ہیں۔سیٹلائٹ انٹرٹینمنٹ نیٹ ورک کے لیے کئی ٹیلی ویژن سیریل لکھے ہیں۔ اس نے 2014 میں اپنے ڈراما سیریل ''**الو برائے فروخت نہیں**'' کے لیے بہترین ٹی وی رائٹر کا لکس اسٹائل ایوارڈ جیتا تھا۔

انہیں ملنے والے اعزازات میں **پین ایوارڈ 2007**،ساحر ایوارڈ **2015** اور **لکس ایوارڈ برائے سکرین رائٹنگ 2014** سمیت ناول ''**پانی مر رہا ہے**'' پر 2019 میں ملنے والا گولڈ میڈل بھی شامل ہے۔

☆☆☆☆☆

بانو قدسیہ

28 نومبر 1928 اردو کی مشہور ناول نویس، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار محترمہ بانو قدسیہ کی تاریخ پیدائش ہے۔ 1950 میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا اور مشہور افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس اشفاق احمد سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ بعدازاں انہوں نے اپنے شوہر کی معیت میں ادبی پرچہ داستان گو جاری کیا۔ بانو قدسیہ کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ناقابل ذکر، بازگشت، امر بیل اور کچھ اور نہیں کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے کئی ناول بھی تحریر کیے۔ ان کا ناول راجہ گدھ اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے جبکہ ان کے ناولٹس میں ایک دن، شہر بے مثال، پروا، موم کی گلیاں اور چہار چمن کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن کے لیے بھی کئی یادگار ڈرامہ سیریلز تحریر کیے۔ جن کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز کا اعزاز عطا کیا ہے۔ اپنی ایک تحریر میں وہ لکھتی ہیں:

> ”میرے اردگرد Kipling کا مقولہ گھومتا رہتا ہے "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"
>
> سوچتا ہوں مل بھی کیسے سکتے ہیں؟ مشرق میں جب سورج نکلتا ہے مغرب میں عین اس وقت آغازِ شب کا منظر ہوتا ہے۔
>
> سورج انسان کے دن رات متعین کرنے والا ہے۔ پھر جب ایک کی رات ہو اور دوسری جگہ سورج کی کرنیں پھیلی ہوں۔
>
> ایک قوم سوتی ہو ایک بیدار ہو تو فاصلے کم ہونے میں نہیں آتے۔“

(حاصل گھاٹ سے اقتباس)

برصغیر میں جتنے بڑے ناول لکھے گئے ہیں راجہ گدھ ان میں سے ایک ہے اور یہ ناول جو ہے وہ بڑا ناگزیر ہے اور وہ لوگ جو اردو ادب سے تعلق رکھتے ہیں ان کو یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے کہ اس میں حلال اور حرام کے بارے میں بہت تفصیلی بحث کی گئی ہے اور دو مختلف تماثیل کے ذریعے سے تشبیہ دی گئی ہے ایک گدھ زندگی بھر حرام کھاتا ہے اور پھر وہ شخص جو اپنی زندگی میں حلال رزق اور حرام کمائی لیتا ہے اور حلال اور حرام سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ حرام کمائی ہے یا حلال روزی ہے بلکہ جو باقی اس انسانی ضروریات ہیں ان کی تکمیل کے لیے بھی جو شخص حرام کو اختیار کرتا ہے تو گدھ کے ساتھ اس کی مماثلت ہوتی ہے پھر حرام کے اثرات جو ہیں وہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور انہوں نے ایک جنیٹکس کی ایک تحقیق کا بھی سہارا لیا ہے جس کے مطابق جو شخص اپنی زندگی کو حلال گزارتا ہے تو اس حلال کی وجہ سے اس کے وجود میں اور اس کے آنے والی نسلوں میں ایک پوزیٹو تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالی کے ساتھ جڑ جاتا ہے ایک وجد کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اس کے برعکس حرام کھانے والے کے اندر ایک خاص قسم کی جنونی اور ایک طرح کا پاگل پن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جنونی پن اور پاگل پن نہ صرف یہ کہ ان کی اپنی زندگی میں رہتا ہے بلکہ نسل در نسل ٹرانسفر ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس ناول کی بیسک تھیم کو بانو قدسیہ نے دو ساتھ ساتھ چلنے والی کہانیوں کے ساتھ جس میں ایک پرندوں کی دنیا میں راجہ گدھ کی کہانی ہے اور دوسری کہانی یونیورسٹی کے طالب علموں کی ہے یونیورسٹی کے پروفیسروں کی ہے ان سب کی زندگیوں میں حلال اور حرام کے فرق کی وجہ سے جو تبدیلی آتی ہے وہ بیان کی گئی ہے قیوم، سیمی اور دیگر کرداروں کے ساتھ کہانی کی بنت ایسی ہے کہ جب اس کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔

ناول سے اقتباس:

''سب بہت خاموشی کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد افتخار اپنے گھر موچی دروازے چلا گیا اور روشن میرے ساتھ سانده آ گئی۔ سارا راستہ ہم خاموش رہے۔ گھر آ کر ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔ کچھ ویزے، پاسپورٹ کی باتیں، سامان چھوڑنے لگنے کے امور، کچھ

بدنامی کے خدشات ،ماں باپ اور پاکستان چھوڑنے کا غم ،زیرِ ذکر رہا۔دوسرے دن مغرب کے وقت روشن نے جدہ واپس جانے کا ذکر نہیں کیا تھا میرے گھر میں سوائے میرے اس حقیقت سے کوئی آگاہ نہ تھا ۔یہ روشن کی میرے گھر میں آخری رات تھی ہم دونوں کے پلنگوں میں ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا لیکن وہ اور میں دم سادے چپ لیٹے تھے پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے مجھے نیند آ گئی۔ پھر ایسے لگا کسی نے میرے بازو پر برف رکھ دی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں ۔روشن میرے پلنگ پر بیٹھی تھی اس کی ٹھنڈی انگلیاں میرے بازو پر تھی۔

" کیا بات ہے روشن"؟

اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی شاید کل وقت نہ ملے آپ بڑے اچھے آدمی ہیں ۔اگر آپ میرے بچے کو قبول کر لیتے تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتی 'زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈا جھونکا میرے بند دل میں گھسا" تم یہاں رہنا چاہتی ہو، میرے پاس۔"

"آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں آپ نے مجھے سب کچھ دیا اور پلٹ کر کچھ نہیں مانگا"۔

"اگر روشن میں تم کو نہ جانے دوں تو افتخار کو بھلا دوں گی"

" نہیں جی "

" پھر یہاں رہنے کا کیا فائدہ ؟"

"آپ مجھ سے ناراض ہیں ۔دیکھیے نا میں یہاں رہ سکتی ہوں ساری عمر آپ کے پاس لیکن افتخار کو نہیں بھول سکتی حالانکہ وہ آپ کے جوتیوں جیسا بھی نہیں ‘‘

"سوجا روشن یہ باتیں فضول ہیں ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا"

اس وقت مجھے روشن میں سیمی عابدہ امتل نہ جانے کون کون نظر آ رہا تھا سامنے بیٹھی اس عورت سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی ساری عمر میں نے عورتوں کے ادھ کھلے دروازوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر والوں نے کبھی آواز دے کر نہ بلایا بالاخر روشن بولی

"آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے"۔

میں کچھ نہیں سوچتا روشن کبھی کبھی بس اتنا کہ کاش تم نے مجھے ایک رات دھوکے میں رہنے دیا ہوتا کاش ایک رات کے لیے تم میری ہوتی۔

"آپ رو رہے ہیں، جی میں کیا کرتی۔ میرا دل اس کا ہے۔ میرے جسم میں اس کی روح پل رہی ہے میں آپ سے کیسے جھوٹ بولتی ہوں۔ میں آپ جیسے اچھے انسان کو اتنا بڑا فریب کیسے دے سکتی تھی۔ وہ چپ ہو کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔ میں نے تکیے پھر سے رکھ لیا۔ ساری رات نہ میں سویا نہ اس نے آنکھ بند کی۔ کاش اس نے اس رات مجھ سے جھوٹ کی زندگی بسر کرنے دی ہوتی بس اب چونکہ ہم میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا اس لیے ہم اتنا ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے جیسے ڈوبے ہوئے جہاز کے مسافر جو کسی جزیرے پہ پناہ لیں اور دنیا سے کٹنے کے بعد رنگ، نسل، قوم، مذہب کی زنجیریں توڑ کر رشتوں میں پروئے جائیں اب میں نے اسے اپنے گاں کے متعلق بتایا کیسے چدرا کی آبادی کلر کے ہاتھوں بے آباد ہوئی۔ کھیت کھلیان اجڑ گئے۔ ڈھور ڈنگر۔ انسان سب چلے گئے پھر میں نے اسے اپنی ماں کی زندگی کے متعلق وہ تفصیلات بتائیں کہ میں خود حیران رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے وہ یاد ہیں" تمہارا کیا خیال ہے؟ روشن کیا بددعا سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں"

"ہاں جی اجڑ جاتی ہیں"

پہلی بار روشن سے بات کرنا بہت آسان تھا وہ پہلو کے بل کہنے سے ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی بولی

میں ایک دفعہ اسکول سے لوٹی تو میری باجی ایک خط پڑھ رہی تھی میں نے خط کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کچھ نہ بتایا بلکہ چھپا دیا کبھی کبھی انسان کو کتنا تجسس ہو جاتا ہے مجھے بھلا خط سے کیا لینا تھا لیکن میں نے وہ خط تلاش کیا اور پڑھا وہ میرے خالو کا خط تھا ایک ایسا خط تھا۔ جو انہیں باجی کو نہیں لکھنا چاہیے تھا اور مجھے خط پڑھنے کے بعد واپس چھپا دینا چاہیے تھا باجی جانتی ہے اس کا کام جانتا لیکن میں نے خط امی کو دے دیا۔ امی نے ابو کو بتایا ابو نے خالو کو بلایا۔ باجی بیچاری کا کوئی

قصور نہیں تھا وہ پھر بھی دھر لی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نکاح کر دیا گیا۔جس سے وقت وہ رخصت ہوئی ہے گھر سے مجھے وہ دن نہیں بھولتا باجی میرے کمرے میں آئی اور بولی

" کاش کبھی تیرے ساتھ بھی ایسا ہو تو بھی شادی کہیں اور کرنا چاہے ہو کہیں اور جائے"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

"تو کیا آپ خالو سے شادی کرنا چاہتی تھی"

بولی" خالو گئے بھاڑ میں مجھے ان سے کیا لینا ہے۔ جہاں میں چاہتی تھی وہاں تو تو نے ہونے نہیں دی نا کمبخت اللہ تجھے بدلہ دے گا"

قیوم صاحب آپ کا کیا خیال ہے مجھے اس دلہن کی بد دعا لگی انسان کو دلہن کی بد عا لگتی ہے کہ کنواری کی ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے ایسی ہی بے معنی باتیں پوچھتے رہے پھر میں نے اسے اپنی ماں کی موت کا بتایا سیمی کا سارا واقعہ سنایا ناپ تول کے قتل کی داستان سنائی لیکن ابا کے متعلق میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا میں اپنے بابا گدھ کی یادوں کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا ۔ مجھے لگتا تھا اس کی گمشدگی یا موت میری اپنی گمشدگی ہے۔میں اپنے ابا کے ساتھ ہی کہیں کھو گیا تھا کہیں ختم ہو گیا تھا۔آخری بار جب میں نے ابا کو دیکھا تھا وہ تیسری منزل پر چمنی کے پاس کھڑا تھا جس میں سے پہلے کبھی دھواں بھی نکلتا تھا کیا میرا ابا اس سے دیوانہ ہوا تھا کیا میرا ابا چا چا غلام کے ساتھ مل کر رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا تھا کیا میرے ابا کو موت کے انتظار نے پاگل کر دیا تھا ۔اگلے دن میں روشن کو لے کر نکلا۔ایئر پورٹ پر افتخار پہلے سے موجود تھا ہم دونوں اس کے پاس پہنچے۔اس نے سادہ سی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔اس کے جسم پر کوئی سامان نہ تھا۔ اناؤسمنٹ سے پہلے ہی وہ اندر جانا چاہتے تھے۔کیونکہ کسی نہ کسی واقف حال کے ملنے کا خطرہ تھا جنگلے کے پاس پہنچ کر افتخار نے سادگی اور خلوص سے ہاتھ ملایا اور بولا اپ نے میری بہت مدد کی ہے۔''

بانو قدسیہ چار فروری 2017 کو انتقال کر گئی۔

☆☆☆☆☆

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات ہیں کہیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ گوجرہ میں پیدا ہوئی اور کہیں یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ امرتسر میں پیدا ہوئی۔

جمیلہ ہاشمی کے والد تاجر پیشہ شخص تھے جو کوئٹہ سے مختلف قسم کا مال لا کر امرتسر کے تاجروں کو فراہم کرتے تھے۔انھوں نے پوری زندگی ملازمت نہیں کی۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ امرتسر میں کپڑے کی کھڈیاں لگا کر اپنے کاروبار کو مضبوط کر چکے تھے۔تقسیم ہند نے ان کے کاروبار کو تباہ کر دیا۔جمیلہ ہاشمی کی والدہ کا نام فضل النسا تھا۔

جمیلہ کی والدہ کی ایک اور بہن تھی، جمیلہ کے نانا، نانی اور خالہ نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن فضل النسا اپنے اصل مسلک پر قائم رہیں۔ وہ صوم وصلو کی پابند راسخ العقیدہ مسلمان تھی۔ جمیلہ ہاشمی تین بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔جمیلہ ہاشمی نے ایف سی کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔

تقسیم ہند کے بعد برکت علی ہاشمی کا گھرانہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں آباد ہو گیا۔ جہاں جمیلہ کی والدہ نے اپنا ایک سکول ممی کا سکول کے نام سے بنایا۔جمیلہ ہاشمی بھی ایم اے کرنے کے بعد درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئیں اور اسلامیہ ہائی سکول ساہیوال کی ہیڈ مسٹریس ہو گئیں۔

جمیلہ ہاشمی نے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ جمیلہ ہاشمی کا رجحان ابتدا سے ہی طوالت کی جانب تھا۔مختصر کہانیوں کے بجائے انہوں نے ناول نگاری کا رستہ چنا۔انہوں نے زیادہ تر ناولٹ لکھے ہیں۔ان کے اسلوب کا اپنا ایک جداگانہ نظام ہے۔ان کی اپنی الگ ڈکشن ہے۔ایک ضابطہ تحریر ہے اور ناول کے سارے

لوازمات اکٹھا کر کے احساسات اور جذبات کی دھیمی آنچ پر پکاتی ہیں۔ان کے ناولوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں ناول ''آتش رفتہ'' پہلی مرتبہ داستان گو لاہور سے چھپنے کے بعد ہندوستان کے موقر رسالہ شاہکار میں ناولٹ نمبر سے شائع ہوا۔اس کے بعد کتابی صورت میں عام ہوا یہی نہیں بلکہ اشفاق حسین نے اس پر سیریل بھی بنایا، اور ہندی کی مشہور کہانی کار امرتا پریتم نے اس ناولٹ کا ہندی میں ''سلگتی آگ'' نام سے ترجمہ بھی کیا۔

''جوگ کی رات'' جمیلہ ہاشمی کا آخری ناول تھا مگر انہیں اچانک موت میں آلیا اور اسے مکمل نہ کر سکی۔ یہ ناول جمیلہ ہاشمی نے اسپین کی سرزمین کے بارے میں لکھا ہے۔اس کے علاوہ ''آتما کی شانتی''، ''چراغ لالہ''، ''اکیلا پھول''، ''ہوائے دل''، ''ناستک'' وغیرہ۔

تلاش بہاراں 1956۔57 کے دوران لکھا گیا۔لیکن 1961 میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔اور اسی سال اس ناول کو آدم جی انعام سے نوازا گیا۔اپنی پہلی ہی تخلیق کی بدولت انہوں نے شہرتِ دوام حاصل کر لی۔ یہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔

ہر لکھاری یا ناول نگار اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنا کام سامنے لاتا ہے۔ یہ انفرادیت اسے اس کے معاصر ناول نگاروں میں ایک نمایاں مقام دیتی ہے اور جمیلہ ہاشمی کے فن کی ایک خصوصیت ان کی انفرادیت بھی تھی اسی لیے ان کے لکھے ہوئے ناول بہت جلدی مقبولیت کی سند پا گئے۔

سکھ گھرانے پر جمیلہ ہاشمی کے دو ناولٹ ''آتش رفتہ'' اور ''داغِ فراق'' شائع ہوئے۔

آتش رفتہ: یہ جمیلہ ہاشمی کا ایک نفسیاتی ناول ہے جس کا شمار اردو کے چند اچھے ناولٹوں میں ہوتا ہے جو مشرقی پنجاب کی سکھ معاشرت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے یہ مختصر ناول ہے جو محض ایک سو سڑسٹھ (167) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں بھی جمیلہ ہاشمی نے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کر کے دلوار سنگھ کی کہانی کو پیش کیا ہے۔پنجاب کے سکھ کلچر کو انہوں نے کمال فن سے اپنی اسلوب میں برتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے مشاہدے کے لیے بیانیہ اسلوب کی ایک نئی راہ دریافت کی اور انہوں نے صحرا میں بسے ہوئے قبائل کی کہانی روہی (چولستان) کو لیا روہی مریم کی کہانی ہے یہ ایک ناولٹ ہے جو کہ مریم کے اردگرد

گھومتا ہے مریم اس کا مرکزی کردار ہے اس کے صفحات کی تعداد تقریباً 80 ہے۔ناول کا ڈکشن سادہ سلیس اور رواں ہے۔''داغ فراق'' نامی ناول سے گھرانے کی کہانی ہے اس کے بعد جمیلہ ہاشمی نے ایک نیا ناول ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رُو'' کے نام سے لکھا۔اس ناول چہرہ بہ چہرہ روبہ رو میں ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے۔ایران کی بابی تحریک کے پس منظر میں ناول لکھا گیا ہے۔

اس تحریک کا مرکز ومحور قرۃ العین طاہرہ ہے جو حسین بھی ہے جمیل بھی ہے ذہین بھی ہے فطین بھی ہے اور ایک ساحرانہ کردار کے مالک ہے اور ساتھ ساتھ پراسرار شخصیت بھی ہے۔

''دشت سوس'' ناول حسین بن منصور حلاج کی زندگی پر مبنی ہے۔اس ناول میں جمیلہ ہاشمی نے منصور حلاج کے فکر سے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔تصوف پر ان کی بہترین کاوش ہے اور یہی ان کا مشہور ترین ناول ہے۔

یہ ناول منصور حلاج کی سماجی معاشرتی ذہنی نفسیاتی سب گرہیں کھولتا ہے منصور حلاج کا تعلق تیسری صدی ہجری کے عہد سے تھا جو کہ خلافت بنو عباس کا دور تھا۔جمیلہ ہاشمی منصور حلاج کے روحانی سفر کو بہت عمدگی سے پیش کر رہی ہیں منصور حلاج نے روحانیت کی منازل کیسے طے کی اور ان کے ظاہری شخصیت پہ اس کا کیا اثر ہوا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے رغبت ہو گئے اور ''انا الحق'' کا نعرہ لگانے لگے جس کی وجہ سے معتوب ٹھہرائے گئے اور انہیں سزا دی گئی اور آخر میں وہ جان سے گئے۔

جمیلہ ہاشمی نے اس روحانی سفر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو حصوں میں روحانی ارتقا کی داستان بیان کی گئی ہے۔

پہلے حصے میں منصور حلاج کے بچپن پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کے اجداد کا خاندانی پس منظر بیان کیا گیا ہے اور ان کا بچپن کہاں گزرا؟ کیسے گزرا ان کی شادی وغیرہ سب کا احاطہ کیا گیا ہے جس سے ناول نگار کا مقصد یہ ہے کہ ہم منصور کی ذہنی حالت کا اچھی طرح سے اندازہ کر سکیں۔

دوسرا حصہ ''نغمہ شوق'' نہایت طویل ہے یہ حلاج کے بغداد واپسی کے ساتھ شروع ہوتا ہے یہ حصہ منصور حلاج کے اس کشف وکرامات کو ظاہر کرتا ہے جس کی تعلیم اور تربیت وہ لے کر آئے ہیں اور جوان کے خون میں

شر بن کے دوڑ رہی ہے گویا کہ جو روحانی منازل وہ طے کر چکے ہیں ان روحانی منازل کا علم اور پھر ان کے مطابق منصور کا عمل موضوع بحث ہے۔اب لوگوں کو منصور کی شکل میں چونکہ ایک انفرادیت سی نظر آتی ہے لہذا وہاں کے باسی منصور کی طرف کھینچے لگتے ہیں اور وہ منصور کی روحانی صلاحیتوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ناول سے ایک اقتباس:

''وہ حاجتوں کا رواں کرنے والا، دعا کرنے والا، رازوں کا جاننے والا کہلایا جانے لگا تھا۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا اس کا مقدر بدل جاتا تھا، محلوں اور عمارتوں میں پیدل سواریوں پر عمر رسیدہ اور جوان دوشیزائیں اور ازدواج، بیمار اور تندرست، مغموم اور خوش شہزادوں اور گداگر، اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی دلوں کا بھید جان لیتا۔ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بتا دیتے۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔''

دشت سوس ناول ایسے مناظر سے بھرا پڑا ہے ایک منظر وہ ہے جب شدید دھوپ کا عالم ہے اور منصور کو میدان میں کھڑا کیا جاتا ہے ایک حبشی اسے سزا دینے کے لیے کھڑا ہے منصور کا استخوانی بدن کوڑے کھانے کے لیے تیار ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول کا فن ناول نگار خواتین سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ اپنے اس ناول کے فن میں تصوف کو ساتھ لے کر چلتی ہیں ''دشت سوس'' نامی ناول میں جس طرح سے انہوں نے منصور حلاج کے حالات بیان کیے ہیں ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔آپ دس جنوری 1988 کو وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئی۔

☆☆☆☆

جیلانی بانو

جیلانی بانو 14 جولائی 1936 میں اتر پردیش، بدایوں، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ اردو ادب سے لگا انھیں اپنے والد صاحب حیرت بدایونی سے ورثے میں ملا تھا جو کہ معروف شاعر تھے۔ بانو کی پرورش خالص ادبی، تہذیبی، روایتی ماحول میں ہوئی۔ اسی ادبی ماحول نے بچپن ہی سے ان کی فکری و تخلیقی تربیت کی جس نے آگے چل کر ان کو نظر نگاروں کی پہلی صف میں کھڑا کیا اور ان کی شہرت ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں پھیلی۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی، باقی تعلیم حیدرآباد سے حاصل کی۔ 1957ء میں بی اے اور 1959 میں اردو ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی شادی عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر، ڈرامہ نگار اور شاعر ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔ ادبی سفر کا آغاز 1952 میں افسانہ **''ایک نظر ادھر بھی''** کی اشاعت سے ہوا جو رسالہ ادب لطیف میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ روشنی کے مینار اور پہلا ناول **''ایوانِ غزل''** تھا انہوں نے ناولوں میں معاشرتی رویوں، طبقاتی ناانصافی اور بالخصوص پسے ہوئے غریب طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا ان کی تحریروں میں تانیثی رنگ، سماجی عدم مساوات، نسائی مسائل نمایاں ہے۔

جیلانی بانو کے فکشن کی بات کریں تو وہ جن کرداروں کو لے کر چلتی ہیں وہ ہمارے معاشرے کے عام کردار ہیں جو عام گھروں میں رہتے ہیں یہ وہ کردار ہیں جن میں معصوم بچے بھی ہیں جن سے بچپن میں ان کی معصومیت چھین لی جاتی ہے جنسی حراست کا یہ نشانہ بنتے ہیں اور وہ کردار بھی ہیں جو کہ نوجوان ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کے مسائل لیے ہوئے ہیں ان میں وہ کردار بھی ہیں جو کہ حیدرآباد دکن کے اس نوابانہ سماجی ماحول میں پلے بڑھے ہیں ان میں سے کچھ میں نوابی خو بھی موجود ہے۔ واجدہ تبسم ہوں یا وحیدہ نسیم یا جیلانی بانو یا زلیخا

حسین ہوں۔

یہ سب حیدر آباد دکن کے جس سماج میں پلی بڑی اور انہوں نے جن حالات کو اپنے اردگرد دیکھا اور محسوس کیا اور ان حالات کے اندر تقسیم ہندوستان کا ایک بہت بڑا واقعہ بھی رونما ہوا انہوں نے تقسیم ہندوستان سے پہلے اور تقسیم ہندوستان کے بعد کے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اصلاح کا کام بھی لیا ہے اور انہوں نے اپنے ان ناولز کے ذریعے اس دور کی نسل کی تربیت کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ٹیلی ویژن سوشل میڈیا نہیں تھا صرف ریڈیو تھا لہٰذا کتاب پڑھی جاتی تھی ہر گھر میں کتاب پہنچتی تھی اور کتاب سے ہی سیکھا جاتا تھا تو انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے تربیت معاشرہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کا مشہور زمانہ ناول **ایوان غزل** ہے جس کی ہیروئن آخر میں خودکشی کر لیتی ہے وہ خود اپنے فن کے بارے میں کہتی ہیں کہ مجھے ناول یا کوئی تحریر یا افسانہ لکھنے کے لیے ایک شعر ہی کافی ہوتا ہے میں ایک شعر سنتی ہوں تو میرے ذہن میں کہانی بن جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والد شاعر تھے اور ان کے گھر پر حیدر آباد دکن میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اس زمانے کے بڑے بڑے نامور شورہ ان مشاعروں میں آیا کرتے تھے جیلانی بانو بھی ان سب کو سنا کرتی تھی یہیں سے ان کی تربیت کا آغاز ہوا لیکن وہ شاعری کی طرف نہیں گئی انہوں نے نثر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ان کے افسانے اور ان کے ناول بے حد مقبول ہوئے اور ان کا شمار موثر اردو ناول نگار خواتین میں ہونے لگا جیلانی بانو صاحبہ کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ رہی کہ ان کے انہیں اپنے شوہر کا تعاون حاصل تھا۔ لکھنے کے دوران ان کے شوہر ان کو مکمل تنہائی مہیا کرتے تھے تاکہ وہ بہتر طریقے سے اور مکمل انہماک سے اپنا کام کر سکیں۔

ااس دور کے ترقی پسند مصنفین اور شاعر سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، جگر مراد آبادی، کرشن چندر، مجروح سلطان پوری وغیرہ کی ان کے گھر میں آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ جیلانی بانو کے ناول درج ذیل ہیں:

ایوانِ غزل

بارشِ سنگ

نروان

جگنو اور ستارے

نغمے کا سفر

جیلانی بانو کا ادبی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔انہوں نے آخری وقت تک نئی نسل کی تربیت کرنے کی کوشش کی اور وہ اپنے گھر پر طلبہ کو جمع کیا کرتی تھیں اور انہیں اردو ادب پر لیکچر دیا کرتی تھیں۔

ان کے کچھ کہانیوں پر ڈرامے اور فلمیں بھی بنی ہیں۔ انہوں نے حیدرآباد پر بننے والی دستاویزی فلم حیدرآباد: ایک شہر ایک تہذیب کا اسکرپٹ بھی تحریر کیا ان کی کہانیوں کے تراجم متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں **انہیں آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، قومی حالی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ، دوشیزہ ایوارڈ اور حکومتِ ہند کا باوقار پدما شری اعزاز** سمیت کئی اہم انعامات سے نوازا گیا۔ جیلانی بانو یکم مارچ 2026 کو تلنگانہ حیدرآباد انڈیا میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری

اردو کی مشہور ادیبہ بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری 22 نومبر 1998 کو ہردوئی کے مقام پر پیدا ہوئی تھیں۔ان کے والد ظفر عمر اردو کے پہلے جاسوسی ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔بیگم حمیدہ اختر حسین کی شادی 1935 میں اختر حسین رائے پوری سے ہوئی تھی جو اردو کے نامور نقاد، محقق اور ادیب تھے۔ 1992 میں اختر حسین رائے پوری کی وفات کے بعد بیگم حمیدہ اختر حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اپنے بے ساختہ اور سادہ اسلوب بیان کی بنا پر اردو کی اہم اہل قلم میں شمار ہونے لگیں۔ان کی خودنوشت سوانح عمری ''ہم سفر کے نام'' سے اشاعت پذیر ہوئی۔انہوں نے خاکوں کے دو مجموعے ''**نایاب ہیں ہم**'' اور ''**چہرے مہرے**'' بھی یادگار چھوڑے۔

''نایاب ہے ہم'' سے سے اقتباس

"وہ یہ ہے کہ یادداشت پر زور ڈال کر وہ سماں آنکھوں کے سامنے لاؤں کہ جب ابا کی ایک ٹانگ مصنوعی تھی تو آخر وہ کس دور سے پیڑوں پر بنی مچانوں پر شکار کے لیے چڑھ جاتے تھے۔ہم لوگ بھی اکثر ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ہمیں کبھی خیال نہ گزرا نہ احساس ہوا کہ ابا کی ایک ٹانگ ہے۔جس انداز سے گھوڑے پر سوار ہوتے،کبھی کوئی فرق محسوس نہ کیا ہاں جب وہ کرکٹ کھیلتے تو رن کوئی دوسرا بناتا اس کے لیے ہمیشہ یوں سوچا کہ ابا خود کیوں نہیں دوڑتے جبکہ دوڑنے کو ماشاءاللہ پلٹن دائیں بائیں موجود ہوں اور جب بیڈمنٹن کھیلے اور شٹل کوک نیچے گر پڑے تو وہ خود

کیوں اٹھائیں کہ چھوٹی پود کو جھٹ سے اٹھا کر دینا چاہیے۔ہم سب نے ان کو پولو بھی اسی طرح کھیلتے دیکھا جیسے سب اور کھیل رہے ہوتے درحقیقت ہم کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان کی ٹانگ اگر کٹی ہوئی ہے تو کہاں سے کٹی ہے وہ یوں کہ ہم لوگ کبھی ابا کے کمرے میں جاتے ہی نہ تھے اور وہ کبھی ہمارے سامنے بغیر مصنوعی ٹانگ لگائے آتے ہی نہ تھے۔صبح تیار ہو کر دفتر جانے سے پہلے ریٹائر ہونے کے بعد بھی یہ چکر لگاتے گھر کے اندر ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے باہر چلے جاتے تو شام کو اندر آ کر ایک پیالی چائے پی کر قلم یا کسی سے ملنے چلے جاتے ٹانگ سوتے وقت اتار کر پلنگ پر لیٹ جاتے پھر ہم کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ان کے پلنگ کمرے میں کسی کی جانے کا سوال ہی کیا تھا سوائے اماں اور ان کے ذاتی بیرے کے جبکہ وہ خود اندر داخل ہوتے وقت یہ کہتے۔

"بیٹی میں اندر آ سکتا ہوں"

اندر آتے تھے لڑکیوں سے شدت سے محبت کرتے لڑکی کی پیدائش پر چھ ہوائی فائر خوشی میں کیے جاتے گھر پر حلوائی آتا،مٹھائی بنتی تھی تقسیم ہوتی،کبھی کسی بیٹے کی پیدائش پر ایسا نہ کیا۔کبھی کسی بھائی کی مجال نہ ہو سکتی تھی کہ بہنوں سے اونچی آواز سے بول سکے۔ہم سب ملا کر آٹھ بہنیں اور پانچ بھائی ماشااللہ تھے۔ اب یہ لکھنے میں زن سے یہ خیال گزرا تو گویا پوری پلٹن تھی۔پر جب تو کبھی ایسا نہ لگا کہ ہم سب بہت سے ہمیشہ ہی چچا،ماموں،خالاؤں کے لڑکے،لڑکیاں اسی قطار میں ہوتے۔پھر کتنے دوستوں کے لڑکے لڑکیاں۔جب 1932 میں والدہ مستقلاً علی گڑھ میں قیام پذیر ہوئیں تو نیلی چھتری نے بورڈنگ ہاس کی شکل اختیار کر لی۔سالانہ امتحان کے دوران میں والد کے دوستوں کی لڑکیاں اور لڑکے پرائیویٹ امتحان دینے کے لیے حیدرآباد،دکن ،مدراس،کلکتہ پشاور ہر طرف سے آجاتے اور ہمیشہ کئی کئی دوستوں کے وہ لڑکے جن کو بورڈنگ سے ان کی شرارتوں کی وجہ سے نکالا ملتا تو وہ نیلی چھتری کے بورڈنگ ہاؤس میں نہ رہیں گے تو اور کیا۔ان بیچاروں کی پڑھائی کا سلسلہ رک جائے۔آخر جب زاہد عمر کو بورڈنگ والوں نے نکل جانے کو کہا کہ یہ اپنی شرارتوں سے نہ صرف اپنی بلکہ دو چار کی اور بھی جان لے لے گا۔ان کو بھی لے ڈوبے گا تو آخر تین سال تک وہ علی گڑھ میں عظیم بیگ،عصمت چغتائی کے والد کے پاس

رہتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ عصمت آپا سے چند روز بڑے تھے۔ جسامت میں بڑی دھان پان اور سارے چغتائی بچے ایک سے ایک دوسرے ہمارے زاہد عمر بھیا کی عصمت آپا خوب خوب ڈھکائی کرتی۔ یہ کہہ کر کمبخت زاہد تجھے مار مار کر درست کر رہی ہوں کہ مجھے شادی تجھ سے کرنی ہوگی۔ ورنہ مجھے کون قبول کرے گا کس کو شامت اپنی بلوانا مقصود ہوگی اور کون مجھ سے مار کھا لیا کرے گا۔ بیچارے ڈر جاتے شاید اس تصور سے بس اتنا کہتے عصمت چاہے جتنا مار لوں شادی تو میں تم سے نہیں کروں گا" ابا کہتے کہ دوستوں کے بیٹے بیٹیاں اپنے ہی تو ہیں۔ نیلی چھتری علی گڑھ میں بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ تعلیم حاصل کی جائے امان اللہ خان پڑھنے سرحد سے آئے تو پانچ ہزار نوکر، گھوڑا ساتھ لائے۔ نواب صاحب کو تار سے اطلاع دی گئی تو انہوں نے جوابی تار دیا کہ نیلی چھتری بھیج دیا جائے۔ دوستو اپنا بھائی روتا ہے۔ اجازت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی امان اللہ تو گھوڑیوں کا سوار پانچ عدد نوکروں کے ساتھ داخل ہوئے تو بھائی نے ان کی خبر کی گئی کہ اب گھر پر ایک گھوڑا ابھی رہے گا۔ مگر والدہ سے کہا:

" بیٹے اگر ہمارے پاس رہ کر پڑھنا ہے تو یہ ملازمین اور گھوڑا تو واپس بھیجنا ہونگے۔'' یہ سن کر امان اللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اماں کی خوشامد کی۔

"اچھا یہ ایک نوکر تو رہنے دیں کہ بغیر پاں دبوائے آخر میں کیسے سوں گا۔"

" چلو تمہاری خوشی پر نوکر رہ سکتا ہے مگر ایک شرط پر یہ پاؤں نہیں دبائے گا"

حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے شوہر اختر حسین رائے پوری کی وفات کے بعد قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا انہوں نے ایک ناول لکھا خاکہ نگاری کی۔ اس دکھنے کی طرف ان کو امادہ جمیل جان بھی نہیں کیا تھا۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری 20 اپریل 2009 کو کراچی میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

حمیدہ جبین

حمیدہ جبین چودہ اگست 1943 میں کوئٹہ میں پیدا ہوئی۔آپ نے 70اور 80 کے دہائی میں خواتین کے لیے ناولز لکھے جن سے آپ نے شہرت حاصل کی۔ حمیدہ جبیں اردو زبان وادب کی ایک معروف پاکستانی ادیبہ، ڈرامانویس، افسانہ نگاراور ناول نگار تھیں۔وہ اپنے معاشرتی اور رومانی ناولوں کی وجہ سے جانی جاتی ہیں، جن میں انہوں نے خواتین کے مسائل اور سماجی موضوعات کو خوبصورتی سے اجاگر کیا۔ان کی شادی اداکار و ادیب جمیل ملک سے ہوئی تھی۔

تاہم آپ کی زیادہ توجہ ناول کی طرف رہی۔آپ کے درج ذیل ناول شائع ہوئے:

1۔شاخِ بریدہ

2۔سرِ مژگاں

3۔زیب

4۔تمنا

5۔عنبرین

6۔روبی

7۔حنا اور پتھر

8۔شمائلہ

9۔امانت

10۔دیا

11۔کشمکش

12۔گیت یہ میرے

اسی کے عشرے میں حمیدہ جبیں نے مڈل ایسٹ میں مزدوری کرنے والے افراد کی پاکستان میں مقیم بیویوں کیلیئے ایک مہم شروع کی اوران خواتین کو قائل کیا کہ شوہروں کے بھیجے ہوئے پیسے کوفضول خرچیوں پہ اڑانے کی بجائے اس سے زمین کے پلاٹ خریدیں۔مسز ملک کے نام سے انہوں نے رئیل اسٹیٹ بزنس کا آغاز کیا۔خواتین میں اس وقت تک بچت کا عمومی رجحان صرف سونا خریدنے تک محدود تھا،لیکن دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کی عام عورتیں پلاٹوں کی مالک بن گئیں۔

کچھ عرصے بعد یہ رجحان غریب طبقے سے نکل کر درمیانے اوراونچے طبقے میں بھی پہنچ گیا اور بلآخر فلم انڈسٹری کی خواتین بشمول نور جہاں، شمیم آرا اور زیبا نے بھی بہت سی ذاتی جائیداد خرید لی۔ جب کاروبار اتنا پھیل گیا تو جمیل ملک نے ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر بیگم کے کاروبار میں شمولیت اختیار کر لی۔

تاہم ایک بڑی کاروباری شخصیت بننے کے بعد بھی لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا چنانچہ لاہور ٹیلی ویژن کے اولین رنگین سیریل ''**جگ بیتی**'' کے بعد انہوں نے ''**رات ریل اور خط**'' اور ''**ایک حقیقت ایک افسانہ**'' جیسے سلسلوں کے لئے بہت سے کھیل تحریر کیے۔

نظریاتی طور پر جمیل ملک خاصے کٹر قوم پرست پاکستانی تھے اور بھارتی فلموں اور ڈراموں کی نمائش کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے کبھی یورپ یا امریکہ جانے کی خواہش ظاہر نہ کی تھی لیکن چند برس پہلے حمیدہ جبین کو کینسر جیسا موذی مرض ہوگیا۔ باہر علاج کے لیے جمیل ملک ان کو لے گئے مگر بے سود اجل آئی لے گئی۔ان کی جمیل ملک سے تین بیٹیاں تھیں۔ 1997 کو لاہور میں ان کی وفات ہوگئی۔

☆☆☆☆

حنا جمشید

ڈاکٹر حنا جمشید افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار، محقق اور اردو زبان و ادب کی استاد ہیں۔ وہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اردو کے اسکالر بھی ہیں۔ تدریس ان کی مصروفیت ہے۔ تصنیف و تالیف اور تنقید و تحقیق ان کا شوق ہے۔ وہ اپنے اس ذوق و شوق کو کتابی صورت میں پیش کرتی رہتی ہیں۔ ساہیوال جیسے تہذیبی شہر کے وقار کو فراواں کرتی ہوئی یہ بے چین مصنفہ اپنی سات عدد وقیع کتابوں سے پاکستان کے جہان فراست کو اپنے علم اور اپنی دانش کے پیہم مظاہر سے متاثر کرنے میں مسلسل مصروف ہیں۔ ڈاکٹر حنا جمشید کی تصنیفی مہمات کا دائرہ تحقیق و تنقید اور تدوین و تسہیل سے لے کر افسانہ نگاری، ناول نگاری اور تاریخ نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا ناول ''ہری یو پیا'' جو کہ قدیم ہڑپائی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے دل چسپ بیان پر مبنی ہے اس پر انھیں اردو ادب کے موقر اعزاز ''آصف فرخی ایوارڈ برائے علم و آگہی'' سے بھی نوازا گیا ہے۔ وہ سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر اردو ادب کی ترویج ویڈیوز کے ذریعے سے کرتی ہیں۔

☆☆☆☆

خالدہ حسین

خالدہ حسین کی پیدائش 18 جولائی 1937 کو لاہور میں ہوئی۔ ان کا پیدائشی نام خالدہ اصغر تھا۔ خالدہ نے پنجاب یونی ورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا تھا۔ انھوں نے 1954 میں قلم تھاما اور کہانیاں لکھنا شروع کیں، لیکن ادبی حلقہ اور سنجیدہ قارئین 60 کی دہائی میں ان کے نام سے واقف ہوئے۔ خالدہ حسین نے اپنے ابتدائی دور کی کہانیاں چند غیر معروف رسائل کو بھیجیں جو شائع ہوئیں اور اس وقت وہ دسویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ بعد میں ان کی تخلیقات معروف جرائد کی زینت بنیں اور تب عظیم افسانہ نگار غلام عباس، قراۃ العین حیدر اور اس دور کے دیگر اہم نام ان کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ وقت بھی آیا جب خالدہ حسین نے ان سے اپنے فن اور اسلوب کی داد پائی۔

ادب میں فکشن بالخصوص ناول کا یہ اہم کردار ہے کہ وہ زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح زندگی کے جو نا قابل بیان پہلو تاریخی کتابوں میں انفرادی یا اجتماعی نقطہ نظر سے پیش نہیں کیے جاتے ناول ان کی پیشکش پر بھی قادر ہے۔

خالدہ حسین کا شمار اردو کے ایسے ناول نگاروں میں کیا جانا چاہیے جنہوں نے معاشرے کے المیوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے کئی موقر جرائد کی زینت بن کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ خالدہ حسین نے خواتین کرداروں کی زندگیوں کے ذریعے ہمیں یہ بتایا ہے کہ پاکستانی عورت جتنی بھی خود مختار ہو جائے مظلوم ہی رہتی ہے۔ ناول کی مرکزی کردار وہ تین لڑکیاں جن کی دلچسپی بے موسمی پھل، رجحان ساز کتابوں اور مقبول عام گانوں سے شروع ہوئی سماجی جبر گھٹن اور پابندیوں نے انہیں ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس ناول میں کسی حد تک وجودی فکر کے اثرات بھی ملتے ہیں لیکن اس کی خاص بات ہمارا بدلتا سماجی نظام

عورتوں کو حقوق دینے کے حوالے سے کس قدر پیچھے ہے اس کی عکاسی کرنا ہے۔ایک کردار کو لکھنے لکھانے سے شغف تھا تو اس کے خاندان میں ہی اس کی مخالفت ہوئی گو کہ اس کے والد ڈھال بن کر ہمیشہ اس کے ساتھ کھڑے رہے۔ایک انقلابی کردار نے اس کی زندگی پر کیسا اثر ڈالا۔، یہ ناول کا اہم واقعہ ہے ۔ یہ ناول بنیادی طور پر ایک آئینہ ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بڑے عہدوں اور چھوٹے ذہنوں کے مالک وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو شادی کے بعد خواتین کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اور ان کی انفرادیت کو ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ناول منطقی اعتبار سے ایک ایسے معاشرے کا قصہ ہمیں سناتا ہے جہاں کچھ بھی مثالی نہیں اور میرا خیال ہے کہ کسی بھی ناول نگار کے لیے یہ ہرگز لازمی نہیں ہوتا کہ وہ سماج کی منظر کشی کو ہمارے سامنے کرتے کرتے اس سماج میں بہتری لانے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دینے لگے۔

ناول کا اسلوب جداگانہ ہے۔ کیونکہ جو فقرے اس ناول کی شان کو بڑھاتے ہیں ان میں یہ خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ سب اردو کے روایتی اسلوب سے جدا ہیں۔ چھوٹے جملوں کے ذریعے پوری بات کرنا، بے جا مثالوں سے گریز اور اختصار پسندی اس ناول کو پاکستانی اردو ناول کی روایت کا ایک اہم حصہ بناتی ہیں۔اس ناول کو خالدہ حسین نے اپنی بہن کے نام اس فارسی ضرب المثل کی صورت میں کیا ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست

خالدہ حسین فکشن میں وجودیت کے لیے مشہور تھی۔فلسفہ وجودیت کا بنیادی مقصد اپنے وجود کو معنی فراہم کرتے ہوئے انسان کی مکمل آزادی پر زور دینا ہے۔ایسی آزادی جو اس پر کسی بھی قسم کے پہرے نہ بٹھائے اور نہ ہی کوئی پابندی عائد کرے بلکہ اپنی زندگی کی سمت متعین کرنے کے لیے انتخاب کی آزادی دے۔

اسی اعتبار سے انسان اپنی منتخب کردہ راہ پر چلنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا ذمے دار بھی خود ہوتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے سبب ہونے والی تباہی و بربادی اور اموات کا سامنے آیا تھا اس نے انسان کے ذہن و دل میں اس بات کو مرتسم کر دیا تھا کہ زندگی محض لایعنیت اور مہملیت کے سوا کچھ نہیں۔اگر زندگی کے کوئی معنی ہیں تو پھر یہ جنگیں اور فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اگر خدا موجود ہے اور اس نے کائنات کو صحیح طور پر چلانے کے کچھ اصول متعین کر رکھے ہیں تو پھر زمین پر یہ بگاڑ کیسا۔اس کشمکش نے انسان کو ذہنی

اذیت میں مبتلا کر دیا۔فرد اور سماج کا باہمی تعلق منقطع ہونے لگا انسان خود اور خدا سے بیگانگیت کا شکار ہونے لگا۔لہذا اسی کے سبب نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا اور اپنے وجود کو اصل اور سب سے اہم بتا کر زندگی کی معنویت کی طرف توجہ دلائی اور انسانی وجود کو انفرادی حیثیت عطا کی ۔وجودیت کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درج بالا تمام فلسفیوں میں کامیو، سارتر، پانٹی اور ہیڈ گر خدا کے وجود کے قائل نہیں تھے لیکن اس کے باوجود تمام مفکرین وجودی فکر کے سلسلے میں چند بنیادی نکات کو اہم قرار دیتے ہیں ۔اور ان کو انہوں نے وجودیت کی اساس قرار دیا ہے خالدہ حسین کا وجودی شعور ناول کے کرداروں میں انکے مکالموں میں کہانی کے اتار چڑھا میں ناول کے پلاٹ اور ڈکشن میں جذب ہو کر روانہ کے ساتھ چلتا ہے۔

ناول سے اقتباس:

" کیا وہاں کے شہر بہت اچھے ہیں۔ادھر کے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ارے۔ارے۔۔۔۔'' وہ ایک دم ہنس دیئے۔''شہر اچھے برے تھوڑی ہوتے ہیں۔شہر تو بس اپنے یا پرائے ہوتے ہیں۔اور جہاں میں رہتا ہوں وہ میرا شہر ہے۔کوئی لاکھ کہتا پھرے کہ تمہارا نہیں۔اسی طرح یہ شہر آپ کا ہے تمام کا تمام۔ٹھیک ہے۔۔۔۔"

اسے سکون سا آ گیا۔کچھ چیزیں ایسی بھی تو ہیں جو انسان کسی کی بھی خاطر نہیں چھوڑ سکتا۔

" کاغذی گھاٹ " خالدہ حسین کا ایک معروف ناول ہے جو کہ 2002 میں شائع ہوا اس راول میں ناسٹلجیا ملتا ہے۔اسکا انداز خود سوانحی انداز ہے ڈاکٹر جی ائی سے مراد اس میں ماضی کو جو ہے وہ ذکر کیا جاتا ہے ماضی کی یاد جو ہے اس ناول میں نمایاں ہے جا بجا علامتی اور استعاراتی کلامیہ ہے۔ناول کا عنوان کاغذی گھاٹ بھی علامتی حقیقت کا حامل ہے کہ امیدوں اور تمناں کی کشتی اور مایوسی کے طوفانوں نے بہا کے لے جاتے ہیں ۔مونا شائستہ سنجیدہ حساس لڑکی ہے وہ ایک ادیبہ بھی ہے۔مونا اپنے سکول اور کالج میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ماضی کے بارے میں گفتگو کرتی ہے وہ وقت کی ستم ظریفی اور تاریخی تناظر کے بدلا انسانی زندگیوں پر تاریخ اور وقت کے اثرات کو پر غور کرتی رہتی ہے۔وہ تنہائی کا شکار ہے۔ناول میں کچھ پر اسرار مافوق الفطرت عناصر بھی موجود ہیں_ مونا بے حد خوب صورت لڑکی ہے۔ناول سے اقتباس:

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں خوف ہے تمہاری بنیاد شاید ہماری 80 فیصد لڑکیاں خوفزدہ ہوتی ہیں اس نے نوٹس کا پلندہ ترتیب دیتے ہوئے کہا۔ ''

" مگر ہر شے اپنے تضادات کے ساتھ ظہور کرتی ہے زہر اور تریاق، زندگی اور موت بلندی اور پستی وغیرہ وغیرہ "

"خوف اور شجاعت'' اس نے بے اختیار کہا۔ "ہاں خوفزدہ لوگوں کے اندر ایک غیر معمولی شجاعت ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو سب ایکشن ریپلے ہیں یا پھر زیادہ مگر یہ انتخاب کا مسئلہ واقعی بہت الجھا ہوا تھا جب قدر کی مقدار اور کیفیت کبھی کسی سے حل ہوئی ہوگی وہ نہ سوچتے ہوئے بھی سوچتی چلی جاتی دراصل یہ سوچ بھی نہ تھی یہ تو اس کے اندر چلنے والا صبح و شام کا مکالمہ تھا۔ ہر وقت ہر لمحے یہ حدیث النفس اس کے وجود کا مفہوم بن چکی تھی۔ ان دیکھی طاقتوں کے سامنے اس آدمی کا پر یکا ہونا اس کو کسی دوسری دنیا میں لے جاتا۔"

ان کے خیال میں لکھنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ انسان خطاؤں سے مبرا نہیں ہے۔ وہ انسان کو اس کی بشری کمزوریوں کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ ان کا فکشن منفرد انداز کے ساتھ ساتھ وجودیت، ناسٹلجیا، عورت اور مرد کی مختلف فکری سوچ، صنفی اختلاف، تضادات لیے ہوئے ہے۔ عام عورت اور خاص عورت کا فرق ایک لکھاری ہونے کا کرب یا کرب ذات ان کے ڈکشن کے اہم موضوع ہیں۔

ناول کا غذ گھاٹ تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ خالدہ کی اپنی کہانی ہے اپنے خاندان کی روداد ہے۔ سوانحی اثرات ناول کی مجموعی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ذاتی ابلاغ کو خالدہ نے ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ خالدہ کا انتقال 11 جنوری 2019 کو اسلام آباد میں ہوا وفات کے وقت ان کی عمر 81 سال تھی۔ بی بی امینہ نے'' خالدہ حسین: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے کتاب لکھی ہے۔

☆☆☆☆

خدیجہ مستور

اردو کی نامور افسانہ نگار محترمہ خدیجہ مستور 11 دسمبر 1927 کو بلسہ، بریلی میں پیدا ہوئیں۔انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز 1942 میں کیا۔ان کے ابتدائی افسانوں کے دو مجموعے "کھیل" اور "بوچھاڑ" کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔ 1947 میں قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ لاہور آگئیں۔پاکستان آنے کے بعد ان کے تین افسانوی مجموعے "چندروز" اور "**تھکے ہارے**" اور "**ٹھنڈا میٹھا پانی**" کے نام سے شائع ہوئے۔اسی دوران انھوں نے دو ناول "**آنگن**" اور "**زمین**" کے نام سے تحریر کیئے۔"آنگن" کا شمار اردو کے صف اول کے ناولوں میں ہوتا ہے،اس ناول پرانہیں 1962 کا آدم جی انعام بھی ملا۔خدیجہ مستور کی چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور اردو کی صف اول کی افسانہ نگاروں میں اور بھائی خالد احمد اردو کے جدید شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

خدیجہ مستور ترقی پسند تحریک کے لکھاریوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے ناولوں نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔

خلاصہ: ہماری درسی کتاب میں شامل سبق خدیجہ مستور کے ناول کا تھوڑا سا حصہ ہے۔ناول کا نام بھی **زمین** ہے پورا ناول پڑھنے کے بعد جو رائے قاری کے ذہن میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ

"پاکستان بننے سے صرف نقصان پہنچا۔مہاجرین دکھوں کی شدت کی وجہ سے ان اقدار سے بھی محروم ہوگئے جو بڑوں کے ادب واحترام کی صورت میں ہمارے پاس تھیں۔"

درسی کتاب میں ناول "**زمین**" سے صرف وہ واقعہ لیا گیا ہے جہاں ساجدہ اور اس کا اپنڈکس کا مریض باپ والٹن کیمپ میں رہائش پذیر تھے۔ساجدہ کے آبا صبح اٹھتے ہی اپنے خیمے سے نکل جاتے۔اور سب کی خیر خبر

لے رہے ہوتے۔کیمپ کے ناظم کو انہوں نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں وہ کپڑے کی دو دکانوں کے مالک تھے جب کہ ہندوستان میں ان کا بڑا گھر نہیں تھا۔انہوں نے اپنے طور پر اپنی بیٹی کو مال دار بنانے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا اسی لیے جب وہ کیمپ سے جانے کا ذکر کرتے ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی۔لیکن ہر خواب پورا نہیں ہوتا۔

ساجدہ کے ابا کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے گئی۔ ڈاکٹر واک پر چلا گیا۔کمپانڈر بیٹھا بوٹیاں کھا رہا تھا۔وہ بھاگی ہوئی ابا کے پاس واپس آئی تو ابا مر چکے تھے۔وہ غم کی شدت سے بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو کیمپ کی خواتین سیپارے کھلے چھوڑ کر سو رہی تھیں۔ وہ آپ ابا کے مردہ چہرے پر سر رکھ کر خاموشی سے رونے لگی کیوں کہ غم کی ایسی شدت میں ہر تسلی دینے والا برا لگتا ہے اور ساجدہ جانتی تھی کہ اس کیمپ تو کیا دنیا میں اس کا کوئی اپنا نہیں رہا۔ ہے جو لوگ تسلیاں دے رہے ہیں وہ سب مطلبی ہیں۔

آنگن خدیجہ مستور کا مشہور زمانہ ناول ہے اس ناول پر ہم ٹی وی نے ڈرامہ بھی بنایا ہے۔ بہت زیادہ شہرت جس نے حاصل کی۔آنگن ڈرامہ تقسیم ہندوستان پر لکھا گیا ہے اس میں تقسیم ہندوستان سے پہلے ہونے والے حالات قیام پاکستان اور قیام پاکستان کی بعد کے حالات کی منظرکشی کی گئی ہے کس طرح سے مسلمانوں کا استحصال کیا گیا۔مختلف کرداروں کے ذریعے اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔ناول کے اہم کرداروں میں چھمی ،بڑے چچا،چھوٹے چچا،منجھلے بھیا،عالیہ،کریمن بوا،تہمینہ،بڑی چچی،کسم،دادی،جمیل بھیا وغیرہ۔

ناول آنگن سے اقتباس:

"لڑکی ذات کیسی ہی شریر کیوں نہ ہو مگر ہوتی اللہ میاں کی گائے ہے۔

بڑی چچی آنسو پونچھنے لگی ذرا دیر بعد عالیہ چھمی کے کمرے میں گئی تو وہ اپنے بستر پر پڑی جانے کن خیالوں میں گم تھی۔

''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا بجیا" چھمی نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔" خیر کوئی بات نہیں۔جب سے ساجدہ آپا آئی تھی۔ان کے روپ میں میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ارے میں نے تو صرف اس لیے نہیں بتایا کہ تم شرما کر کمرے میں چھپ رہو گی۔"

"مجھے ایسی شرم سے چڑھ ہے۔"

"آج تمہارے مہندی لگے گی ۔تم مایوں بٹھائی جاؤ گی ۔بس آج سے شرم شروع کر دو۔''

چھمی اسے وحشیوں کی طرح تک رہی تھی۔اس کے چہرے پر ذرا بھی شرم نہ تھی۔وہ اٹھ کر کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی اور عالیہ کو تہمینہ آپا یاد آ گئی۔ ڈھیروں خدشات نے اسے جکڑ کر رکھ دیا"۔چھمی تو بھی کہیں بالی نہ ہو جانا۔''اس نے سوچا کہ ان دنوں وہ چھمی کا سایہ بن جائے گی۔ وہ چھمی کو کچھ بھی نہ کرنے دے گی۔عالیہ بھی چھمی کے قریب ٹک گئی۔شام دبے قدم چلی آ رہی تھی۔چھمی لٹی، پٹی ویران بیٹھی تھی سب مصروف تھے۔بچے شور مچا رہے تھے۔کریمن بوا وزیر آباد کی مہندی پیس رہی تھی مگر عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول آنگن وجودی تجربے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ہجرت کے تجربے کے طور پر ابھر کے سامنے آیا ہے۔ ناول کے کرداران کے نام دلی کی تہذیب کے عکاس ہیں۔ ناول کی زبان بھی دلی کی زبان ہے ناول میں بتائی گئی رسومات لوگوں کے رویے غرض یہ کے ناول ایک ماسٹر پیس کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناول سے اقتباس:

"ذرا ہوش میں رہیے گا بھیا۔ ہاں میں بجیا کی وجہ سے آپ کو جواب نہیں دینا چاہتی ورنہ۔"

چھمی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہٹ جایئے میں خود لے جاں گی بجیا کا بستر۔"اور بستر بند گھسیٹ کر زینوں پر چڑھنے لگی۔

"ارے چھمی گر جائے گی تو اپنی جان کے لاگو رہتی ہے۔''بڑی چچی پان لگاتے لگاتے گھبرا کر اٹھ گئی۔

" گرنے دو اماں ،کبھی تو میں بھی اس کو بے بس دیکھوں۔"۔جمیل بھیا ہنسے۔

"واہ کیا بات ہے بے بس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جمیل بھیا۔''عالیہ نے ذرا تن سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لی وہ تو پہلے ہی اسے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے وہ جلدی سے

چھمی کے پیچھے ہولی۔ مگر بستر بند پہلے ہی اوپر جا چکا تھا چھمی اسے دیکھ کر بڑے فخر سے مسکرائی۔

"دیکھیے بجیا میں لے آئی نا اکیلے۔ بڑے آئے جمیل بھیا ذرا سا سامان اٹھا کر تھک بیٹھے تھے۔"

ناول **زمین** 1983ء میں شائع ہوا برصغیر کی تقسیم ایک ایسا الم ناک واقعہ تھا جس کے انسانی زندگی اور معاشرے پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اس واقعے میں برصغیر کے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔خدیجہ مستور جو مشہور ترین اردو ناول **آنگن** لکھ کر شہر سے تمام آ چکی تھی۔

انہوں نے بھی تقسیم اور ہجرت کے سماجی و معاشرتی اثرات کو محسوس کیا اور ناول **آنگن** لکھ کر برصغیر کے کیا اثرات پیدا ہوئے انہوں نے واضح کیا۔انہوں نے ناول کا آغاز پاکستان کے قیام سے جبکہ ناول **زمین** کا اختتام پاکستان کے ٹوٹنے اور طاقت کے زور پر جمہوری نظام کو لپیٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنے کے واقعات سے ہوتا ہے۔راول زمین کو ہم امدن کی ہی توسیع قرار دے سکتے ہیں ایک زمین کے ٹکڑے کے حصول کی جدوجہد کی داستان ہے، جبکہ **زمین** ناول اس ٹکڑے کو حاصل کرنے کے بعد وہاں کے حالات اور واقعات کی خون چکاں کہانی ہے۔

آغاز میں پاکستانی مہاجر کیمپ کا منظر دکھایا گیا ہے ایک بوڑھا جو ہجرت کر کے آیا ہے، مگر اس کی بیٹی اس سے جدا ہو چکی ہے۔اغوا ہو چکی ہے۔بوڑھا اس کو یاد کر کے آہیں بھر رہا ہے لوگ اسے پاگل سمجھ کر پاگل خانے میں داخل کروا دیتے ہیں۔کاظم اس بوڑھے کو کہتا ہے:

"بابا تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا لوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی تمہاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی"

ناول کے کرداروں میں ساجدہ، بابا، کاظم، رمضان، صلاح الدین، ناظم، خالہ بی، تاجی، لالی وغیرہ ناول کے کردار حقیقی اور جیتے جاگتے معاشرے کے کردار ہیں اور معاشرے کے آئینہ دار ہیں۔مصنفہ کو نسوانی کرداروں کی نفسیات سے گہری واقفیت ہے۔مہاجروں کو نیا ملک مل گیا مگر وہ ماضی کو یاد کرتے ہیں اپنی چھوڑی ہوئی ملکیت کو یاد کرتے ہیں۔ناول کی کہانی آنگن کی طرح دلچسپ ہے۔

خدیجہ مستور کے ناولوں کے کردار جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہیں اگر خواتین کی بات کی جائے تو

خواتین سگھڑ ہیں۔سلیقہ مند ہیں اپنی عزت کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ان کے مقابل جو منفی کردار ہیں ان کو لے کر خدیجہ مستور صاحبہ نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح کے منفی سوچ کے حامل افراد بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں اور اپنے عہدوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں یہ ناول **''زمین''** خدیجہ مستور کی وفات کے بعد 1982 میں شائع ہوا۔

ان عظیم ناولوں کی خالق خدیجہ مستور جولائی 1982 کو لندن میں وفات پا گئیں۔اور لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ ممتاز

ڈاکٹر خدیجہ ممتاز 1955 میں تھریسور ضلع کے کٹور میں پیدا ہوئی۔ خدیجہ ممتاز نے اپنا پری ڈگری کورس سینٹ جوزف کالج، ارنجالکوڈا سے مکمل کیا اور کالی کٹ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ جو گائناکالوجی میں ہے۔ وہ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر ہے اور کالی کٹ میڈیکل کالج میں گائناکالوجی اور پرسوتی کے پروفیسر کے طور پر کام کر رہی ہیں۔

انہوں نے جون 2013 میں سرکاری ملازمت کے لیے درخواست دی تاکہ کالی کٹ میڈیکل کالج سے اپنی سروس کے اختتام پر اپنے تبادلے کے خلاف احتجاج کیا جاسکے۔ وہ اس وقت کیرالہ ساہتیہ اکیڈمی کی وائس چیئرمین ہیں اور اکیڈمک کونسل ممبر، تھونچا تھیز وتھاچن ملیالم یونیورسٹی، ترور، کیرالہ میں بھی منتخب ہوئی ہیں۔ وہ او اینڈ جی، مالابار میڈیکل کالج، موداکلور، کوزی کوڈ میں وزٹنگ پروفیسر بھی ہیں۔

خدیجہ ممتاز نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز اتھاتھیر تھنگل منگینیو رنو سے کیا جو پہلے ہفتہ وار چندریکا میں سیریل ناول کے طور پر اور بعد میں 2004 میں کرنٹ بکس کی کتاب کے طور پر شائع ہوا۔ ممتاز نے اپنے ناول برسا (2007) سے شہرت حاصل کی جو ایک بڑی تنقیدی اور مقبول کامیابی تھی۔ اس کتاب کے تحت مسلم خواتین محروم زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کتاب کو ملیالم ادب میں ایک سنگ میل قرار دیا گیا۔

اس نے سال 2010 کے لیے باوقار کیرالہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ جیتا۔ خدیجہ ممتاز کا اگلا ناول اتھرام، 28 جنوری 2011 کو کوچی میں 12 ویں بین الاقوامی کتاب میلے میں ریلیز ہوا۔ اس کو بھی ناقدین کی جانب سے زبردست پذیرائی ملی۔ معروف مصنف یو اے خدر کے مطابق یہ ناول ان کے مشہور برسا کے بعد متنوع قسم کے پڑھنے اور تشریحات کو متحرک کرنے کے لیے یقینی تھا کیونکہ ڈاکٹر خدیجہ ممتاز نے ایک طبی پریکٹیشنر کے طور پر

جو کام کیا۔ ان کے بیان کا منفرد انداز جو کرداروں کے اندرونی تنازعات کے ذریعے تیار ہوتا ہے وہ یقینی طور پر پورے کام میں قارئین کی توجہ کو مجبور کرتا ہے۔ 2012 میں اس نے ماتھروکم کے عنوان سے گائنا کالوجی پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ انھوں نے بطور ڈاکٹر ایک مجموعہ ڈاکٹر ڈیواملا کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ وہ ایک قابل ذکر کالم نگار بھی ہیں جو مختلف رسائل میں مضامین لکھتی ہیں۔

☆☆☆☆

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ 1924 کوراولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ان کا اصل نام رضیہ نیاز بٹ تھا۔ان کا زیادہ تر بچپن پشاور میں گزارا۔ چوں کہ انھیں شروع ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا تھا تو مطالعے کا شوق بھی رہا جس نے انھیں بھی لکھنے لکھانے پر اکسایا۔گھر کے ماحول اور مطالعے کے شوق نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ اسکول کے زمانے میں ہی انھوں نے اردو کے مضمون میں اپنے معیاری مضامین اور تحریروں کی وجہ سے اساتذہ کی توجہ حاصل کرلی۔اساتذہ کی تعریفوں کے ساتھ ان کے والد کو بھی احساس ہوا کہ ان کی بیٹی زرخیز اور تخلیقی ذہن کی حامل ہے اور انھوں نے رضیہ بٹ کی بہت حوصلہ افزائی اور راہنمائی کی۔پہلی کہانی انہوں نے 16 سال کی عمر میں لکھی جو ایک ادبی جریدے میں شائع ہوئی۔ یوں ان کا ادبی سفر شروع ہو گیا۔

اردو ادب اور خاص طور پر ناول نگاری میں جن مصنفین کا نام سرفہرست ہے ان میں رضیہ بٹ اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی تھیں۔رضیہ بٹ اردو کی مشہور و معروف ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔انہیں پاکستان میں ناول نگاری کی دنیا میں ممتاز ترین مقام حاصل ہے۔ رومانٹک کہانیوں، فیملی ڈرامہ میں خواتین کو مرکزی کرداروں میں پیش کرنے میں رضیہ بٹ کو کمال حاصل تھا۔رضیہ بٹ کی ابتدائی زندگی کے اوراق الٹیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق کشمیر کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔

رضیہ بٹ کا پہلا ناول نائلہ 1946 شائع ہوا۔ اسی سال عبدالعلی بٹ کے ساتھ ان کی شادی بھی ہوگئی۔شادی کے بعد انہوں نے لکھنے سے چند سالوں کا بریک لیا اور 1950 میں لکھنے کا کام دوبارہ شروع کیا اور پھر یہ سلسلہ بینائی متاثر ہونے کے باوجود ان کی موت تک جاری رہا۔انہوں نے 50 سے زائد ناول اور 350 افسانے اور ریڈیو ڈرامے بھی لکھے۔رضیہ بٹ نے اپنے ناولوں میں عورت کے کردار اور اس کے فرائض و ذمہ داریوں کو خاص اہمیت دی اور ان سے متعلق موضوعات اور ایسے مسائل کو اجاگر کیا جن پر افادی مباحث

اور تبصرے سامنے آئے۔ ان کا ناول ''بچھڑے لمحے'' ان کی حقیقی زندگی سے نزدیک ترین محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں کی خاصیت یہ تھی کہ وہ ان میں زندگی کی تلخ حقیقت کے عنصر کو یوں نمایاں کرتی تھیں کہ ایک طرف معاشرتی ناہمواریوں اور اداس لمحوں کا تاثر قائم رہتا تو دوسری جانب چلتے پھرتے کرداروں اور الفاظ کی اثر انگیزی بھی برقرار رہتی تھی۔ انھیں خواتین میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ناول نگار کا درجہ حاصل ہے۔

رضیہ بٹ کے مقبول ترین ناول میں **بانو، نائلہ، بینا، چاہت، فاصلے، میں کون ہوں، ناجیہ، نورین، ریطہ، روپ، سبین، صائقہ، زندگی، اماں، مہرو، آئینہ، چاہتیں کیسی، ریشم، زندگی، سارا، وحشی، عاشی، مسرتوں کا شہر، معاملے دل کے** اور افسانوی مجموعوں میں **آدھی کہانی، ذراسی کوتاہی، رانگ نمبر، آئیڈیل، دکھ سکھ** اپنے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان ایک سفر نامہ **امریکی یاترا** کے نام سے شائع ہوا۔ **بچھڑے لمحے** رضیہ بٹ کی آپ بیتی ہے، یہ بھی ان کے ناولوں کی طرح بے حد مقبول ہوئی۔

بانو ناول اقتباس:

> "حسن اور رابعہ کا درد مشترکہ تھا حسن اپنے محبوب کو کھو کر طلب رہا تھا رابعہ بھی اپنے محبوب کے قرب میں صدیوں کی مسافت پا کر سلگ رہی تھی لیکن اب اس پر محبت کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے۔ ایک روحانی بندھن ہے۔ ایک عالمگیر سچائی ہے۔ حسن بانو کے لیے تڑپ رہا تھا وہ حسن کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس تڑپ میں خودغرضی نہیں تھی۔ محبوب کو اپنا لینے کی خواہش نہیں تھی۔ جسمانی ملاپ کی تمنا بھی نہیں تھی۔ تڑپ صرف تڑپ تھی، اس لیے کہ یہ ایک آفاقی جذبہ تھا روحانی بندھن اور عالمگیر سچائی تھی۔"

بانو ناول داستان خونچکاں ہے۔ بانو نامی عورت کی دردمند داستان ہے۔ قیام پاکستان کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دی گئی۔

> "قوموں کی بقا کے چراغ شہیدوں کے لہو سے جلتے ہیں۔ قوموں کے کردار میں انتقام کی قوت بہنوں اور بیٹیوں کی لٹی ہوئی عصمتوں کے چرکوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اچھا ہی ہوا تم نے یہ چرکے لگا دیے ورنہ ہو سکتا میری قوم غافل ہو جاتی۔ تیری قوم کو راہ دکھانے والا تیرا جناح مر گیا۔

اب غافل ہی سمجھا اپنی قوم کو میری قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہوگئی۔ وہ پھر جناح پیدا کرے گی"۔

ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان کی فلمی تاریخ کے انتہائی عروج کے دور میں ان کے چند ناولوں پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔ جن سے انہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے ناولوں سے ماخوذ کہانیوں پر مشتمل فلموں میں **"نائیلہ"، "انیلہ"، "لغزش"، "پیاسا"، "محبت ہو تو ایسی ہو" اور "صائقہ"** جیسی سپر ہٹ فلمیں شامل ہیں۔ ان کی لکھی گئی چند کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا گیا۔ **ان میں نورین، صائقہ** شامل ہیں۔

صائقہ ناول سے اقتباس:

"ایک ماں محرومیوں کی اذیت سے آشنا ماں اپنے لخت جگر کی وصیتیں لوٹانے کے لیے بھیانک سے بھیانک قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ سر کے بال بھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھے۔ بٹ کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ لیکن ٹانگیں سہارے کے باوجود اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نظر آ رہی تھی۔

"وعدہ کرو" فوزیہ آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے بولی" کہ تم ریحان اور سمیرہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گی۔"

"امی حضور" صائقہ نے سراپا درد بن کر اس کی طرف دیکھا لیکن خون خوار نظروں میں رحم کی بجائے ترحم تھا۔ صائقہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

"مجھے آنسوں سے مجبور کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میری بات کا جواب دو۔"

وہ چند لمحے رکیں پھر غرائی۔" تم مصالحت پر آمادہ نہ ہوئی تو میں دوسرا طریقہ بھی استعمال کر سکتی ہو۔" سر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آسیہ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کی نالی کا رخ صائقہ کی طرف تھا۔

"اپنی جان عزیز ہے تو وعدہ کرو نہیں تو میں ایک لمحے میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ میری بچی اگر ناکامی کے زندگی جیے گی تو تم بھی بہاریں لوٹنے کے لیے نہیں ہوگی۔ بولو۔ جواب تو دو۔ ورنہ۔"

ایک ہاتھ لپکا بجلی کی سی تیزی سے فوزیہ کے ہاتھ پر جھپٹا اور پستول چند گز کے فاصلے پر جا

گرا۔ صائقہ اور فوزیہ نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ جھپٹنے والی آیا تھی۔ جو صائقہ کے ڈریسنگ روم سے اچانک نکل آئی تھی آیا کہ مداخلت پر فوزیہ کا خیال اور بڑھ گیا۔ وہ چیل کی طرح پستول پر جھپٹی لیکن آیا نے تیزی سے بڑھ کر پستول اٹھالیا صائقہ بت بنی وہیں کھڑی تھی۔ اس کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کرلی تھی۔"

اردو ادب اور ناول نگاری کو ایک خاص رنگ دینے والی ناول نگار رضیہ بٹ نے تحریک پاکستان میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔انھوں نے تقسیمِ ہند کے چشم دید واقعات کو بھی اپنے ناولوں میں شامل کیا ہے۔ان کے قیام پاکستان کے پس منظر پر لکھے گئے مقبول ترین ناول ''بانو'' کو ٹی وی پر داستان کے نام سے قسط وار پیش کیا گیا۔بانو وہ ناول تھا۔جو قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہو۔ اور اس نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کے بعد اسے ٹیلی ویژن پر بھی پیش کیا گیا۔

رضیہ بٹ کی رومانوی اور گھریلو موضوعات پر مبنی کہانیاں اس زمانے میں بہت مقبول ہوئیں جب تقریبا ہر گھر میں عورتیں بہت شوق سے ادبی جرائد، مختلف رسائل اور ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھیں ۔مصنفہ کی کہانیوں کا مرکزی کردار بھی یہی عورت اور اس کی گھریلو زندگی تھی۔ جسے انھوں نے اپنے ناولوں کے رومانوی کرداروں کے ذریعے بڑی خوبی سے پیش کیا۔

اردو کی یہ مشہور ناول نگار اور کہانی نویس طویل علالت کے بعد 89 برس کی عمر میں 4 اکتوبر 2012 کو خالق حقیقی سے جاملی۔

☆☆☆☆

رضیہ سجاد ظہیر

رضیہ دلشاد ظہیر سے شادی کے بعد رضیہ سجاد ظہیر بنی۔ رضیہ 15 فروری 1917 کو اجمیر شریف راجستھان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد خان بہادر سید رضا حسین اجمیر اسلامیہ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ والدہ کا تعلق سنبھل، مراد آباد سے تھا۔ دودھیال بنارس میں تھا۔ گھرانہ مذہبی تھا مگر تعلیم کی اہمیت سے واقف تھا۔ اسی لیے ان کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ پردے میں رہنے کے باوجود انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ شادی کے بعد آلہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ دس ستمبر 1938 کو سجاد ظہیر سے شادی ہوئی۔ انہوں نے "پھول"، "تہذیب نسواں" اور "عصمت" وغیرہ میں ضیا دلشاد کے نام سے لکھا۔ بعد میں رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے لکھنے لگی رضیہ سجاد ظہیر 1936 کی ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہیں۔ ان کا ذہنی رجحان کمیونزم کی طرف تھا۔ ان کے ناولوں کا موضوع اور مقصد بھی ترقی پسند رجحان کو پیش کرنا تھا 1953 میں ان کا ناول "سر شام" شائع ہوا، "کانٹے" 1954 میں ریلیز ہوا، جبکہ "سمن" (ایک اور ناول) 1964 میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے جیل سے اپنے شوہر کے خطوط "**نقوش زندہ** (1954)" کو ترتیب دے کر شائع کیا۔

سجاد ظہیر کی گرفتاری کے بعد رضیہ سجاد کے سامنے تین بیٹیوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی تھی اور اپنے گزر بسر کے لیے ذریعہ معاش تلاش کرنا بھی تھا۔ اس کے لیے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینی شروع کی اور کسی تعلیمی ادارے میں ملازمت کے حصول کی کوشش بھی شروع کر دی۔ وہ لکھنو کے کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے پڑھانے لگی۔ جب تک لکھنو میں مقیم رہی۔ انہوں نے یہ ملازمت جاری رکھی۔ 1973 میں سجاد ظہیر صاحب کا انتقال ہو گیا ان کے انتقال کا ذکر ذکیہ حسنین صاحبہ نے کچھ یوں کیا ہے۔

"میں الہ آباد سے پہنچی تو آپا (رضیہ سجاد) گم صم بیٹھی تھی۔سگرٹ پر سگرٹ پیے جا رہی تھیں۔
پتھر کی طرح خاموش آنکھ میں ایک آنسو نہیں۔ میں لپٹ کر رونے لگی تو بولی

"بس کرو، بی بی۔" نجمہ لندن میں، نسیم باپ کی لاش لینے گئی ہیں، نادرہ جرمنی میں ایک چھوٹی سی نور ساتھ میں تھی۔آپا بالکل تنہا ہوگئی۔بہت خاموشی سے جدائی برداشت کی لیکن جیسے گھٹتی گئی روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ 1976 میں شدید دل کا دورہ پڑا لیکن جھیل گئی میں۔ ان کے ساتھ اس وقت تک ہسپتال میں رہی۔ ان کی کمزوری اور مجبوری دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔لیکن پھر بھی مجھ سے کہتی ہیں۔

"بی بی دعا کرو میری آنکھوں کی روشنی اور انگلیوں کی طاقت کبھی نہ جائے۔کیونکہ میں بغیر اس کے زندہ نہیں رہ سکتی اگر تخلیق کا چشمہ سوکھ جائے گا تو کیسے زندہ رہوں گی۔"

کچھ عرصے بعد رضیہ سجاد ظہیر اپنی بڑی بیٹی نجمہ ظہیر باقر کے ساتھ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک بنگلے میں رہنے لگی۔ دراصل سجاد ظہیر صاحب کے انتقال کے بعد رضیہ آپا کی زندگی بالکل اداس اور مایوسیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ان کی شخصیت میں جو رنگینی رونق اور جاذبیت تھی وہ سب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ انہیں ذیابیطس کا مرض ہوگیا تھا اور وہ پرہیز بالکل نہیں کرتی تھی۔رضیہ سجاد ظہیر کا پہلا ناول "سرشام" ہے جو کہ 1953 میں مکمل ہوا یہ ناول ضخامت کے لحاظ سے طویل نہیں ہے۔البتہ اس میں ناول نگاری کی مختلف خصوصیات پوری طرح سے موجود ہیں۔اس ناول میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے عوام اور خاص کر نوجوانوں کی ذہنی کشمکش اور آزادی کے لیے ان کی قربانی اور جدوجہد کی تصویر کشی کی ہے۔ دراصل آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی بہت سے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ خاص طور پر متوسط طبقے اور چھوٹے زمینداروں کی زندگی زیادہ کشمکش کا سامنا کر رہی تھی اس ناول میں انہوں نے لکھنو اور اس کے قرب و جوار کی معاشرت کو موضوع بنایا ہے۔ان مسائل کا اثر تہذیبی پہلو پر بھی گہرا پڑا۔ اس ناول کے متعلق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول لکھنے سے پہلے رضیہ سجاد ظہیر اردو ادب کے اہم ناولز کا مطالعہ کر چکی تھیں۔ناول سے ایک اقتباس:

"معاف کرنا حلیمہ، مگر جب ان باتوں کا ذکر ہوتا ہے تو میں اپنے جذبات کو روک نہیں سکتا۔

لیکن میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ آج بنگال کے بچے بچے کی یہی جذبات ہیں کہ ہم بنگال کو بکنے نہیں دیں حلیمہ ہم ٹیگور کے سرزمین کو ہوائی اڈوں کے لیے نہیں بیچ سکتے۔ ہم نزرل کی زبان کٹنے نہیں دیں گے۔ ہمارے جیتے جی یہ نہیں ہوگا۔ تم دیکھنا ہم ایک ایک گاؤں میں جائیں گے ۔ایک ایک آدمی کے آگے دامن پھیلائیں گے ۔ تم اگلے الیکشن میں دیکھنا اور ہماری سب سے بڑی کوشش ہوگی کہ ہندوستان پاکستان کے اچھے تعلقات قائم ہوسکیں۔ بنگال نے کتنے بہادر پیدا کیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے بدنصیبی یہ کیسے کیسے غداروں کو بھی جنم دیا ہے۔"

ان کا دوسرا ناول " کانٹے " ہے رضیہ سجاد ظہیر نے جس وقت ناول لکھا۔ اس وقت ہندوستانی سماج اور معاشرے میں طبقاتی کشمکش شدت اختیار کیے ہوئے تھی۔اس ناول میں دو خاندانوں کی کہانی ہے۔ جس میں خاندانی عزت شامل شوکت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور انسان کے اپنے نجی جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس ماحول میں جاوید اور ثریا پرورش پاتے ہیں۔ثریا بچپن سے قدرتی طور پر حساس اور ڈرپوک ہوتی ہے۔ثریا کی ماں بیگم رفیق کے اوپر اتنی زیادہ ذمہ داریاں ہیں۔کہ انہیں اپنی بیٹی کی ذہنی حالت سمجھنے کا موقع نہیں ملتا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ثریا کے دل میں جاوید کی محبت ہے جو اسے بے چین رکھتی ہے جاوید کی ماں کا بچپن میں انتقال ہوگیا ہے۔لیکن جاوید انقلابی ذہن رکھتا ہے اور وہ ایک دفتر کے اخبار میں نوکری کر لیتا ہے۔دوسری طرف اس ناول کا ایک کردار را تو ہے جو ایک بھکارن ہے وہ بھی ایک شریف اور عزت دار عورت ہے۔ وہ ثریا کے مقابلے میں نڈر عورت ہے اور فیصلہ کرنے کے ہمت رکھتی ہے۔اسی وجہ سے وہ قاسم کو حاصل کر لیتی ہے یہ ناول معاشرت کے بعض بلند گوشوں کی ترجمانی کرتا ہے اس کے مطالعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی شخصیت میں عزم وعمل اور قوت ارادی کا عنصر کتنی اہمیت رکھتا ہے۔انہی خصوصیت کے ذریعے انسان اپنے اندر حوصلے کی بلندی اور حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرسکتا ہے۔

" سمن " رضیہ سجاد ظہیر کا تیسرا ناول ہے ناول کے ابتدائی حصے میں ایک رئیس اور تعلقدار خاندان کی کیفیات اور طرز معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ بیگم سخاوت نینی تال جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں اور وہ اس سلسلے میں اپنے جاگیردارانہ اور امیرانہ وقار کو پوری طرح ظاہر کر رہی ہیں۔

ناول سے ایک اقتباس:

"دیکھو یوسف اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ انجمن کسی کو ادیب یا شاعر بنا دے گی تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ صورتحال صرف اتنی ہے کہ تنظیم کے بغیر کوئی محنت کش طبقہ پنپ نہیں سکتا اور ادیب سے زیادہ محنت کون کرتا ہے۔جس طرح ہر تنظیم میں وہی لوگ نمایاں ہوتے ہیں اور انہی کی عزت ہوتی ہے جو اپنے کام میں مکمل ہوتے ہیں اور شعور میں بھی وہی حال ادیب کا بھی ہونا چاہیے میں کسی ایسے طالب علم کو طالب علموں کا رہبر نہیں قبول کر سکتا جو پڑھنے لکھنے میں پھسڈی اور ناکارہ ہوں۔ وہ ادیب تنظیم نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہیں گے۔جو سستا گھٹیا بے جان ادب تخلیق کرتے ہیں۔اب تم سے پوچھتا ہوں کہ تم لوگ اتنی خوشامد کر کے فہمی صاحب کو لائے۔دو کہانیاں انہوں نے پڑھیں۔ان میں سے کون سی ایسی تھی جسے کہانی کہا جائے۔ بات کرتے ہیں ادب میں انفرادی آزادی کی۔ انفرادی آزادی کے ساتھ کون سا تیر مارا انہوں نے۔"

اس طرح مختلف واقعات کے ذریعے ناول میں عملی اور نظریاتی طور پر کمزوروں غریبوں اور بے سہارا لوگوں سے ہمدردی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد تھا کہ یہ مارکسزم سے متاثر تھی اور ان کے لکھاری انہی نظریات کا پرچار اپنی تحریروں میں کیا کرتے تھے جیسا کہ رضیہ سجاد حیدر صاحبہ نے کیا۔ناول کا مرکزی کردار ہیروئن سمن ہے جس کے نام پر ناول کا نام سمن رکھا گیا ہے وہ ایک طوائف زادی ہے۔اس کا بچپن ماں کے سائے میں گزرا ہے اور وہیں اس کی تعلیم بھی مکمل ہوئی ہے اس نے ماسٹر رام دین سے ہندی اردو انگریزی اور حساب کی اچھی تعلیم حاصل کر لی تھی اور ساتھ ہی موسیقی میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔

ناول سے ایک اقتباس:

سمن کے کچے دماغ میں یہ بات ٹھونک کر بٹھا دی کہ رنڈی کی لڑکی کا رنڈی ہونا بالکل ضروری نہیں ہے، کہ شرافت انسان کی طبیعت میں ہوتی ہے اس کی وراثت میں نہیں کہ اس کی موسیقی ایک عظیم اور حسین فن ہے اور اسے گندگی کے ساتھ آلودہ کر کے اس کی قیمت روپے میں

چکائی جائے اس سے بڑھ کر گناہ اور کمینہ پن کچھ اور نہیں۔"

ناول میں پروفیسر رفیق کے کردار کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جاوید نور پور کے جاگیردار راجہ علی حسین کا بیٹا ہے۔ جو دیکھنے میں خوبصورت اور تندرست ہے۔ لیکن وہ کالا بازاری کرتا ہے۔وہ لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلا کر ان کی زندگیاں برباد کرتا ہے۔ایسے۔کردار ہمارے معاشرے میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جن کا ظاہر الگ ہوتا ہے اور باطن الگ جب بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اسے اپنی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مارکسزم نامی تحریک جب اٹھی تو زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں نے اس کا ساتھ دیا اور ترقی پسند شاعر اور ادیب کہلائے۔اسی طرح ملا طبقہ نے اس کی مخالفت کی جیسا کہ ان کا وطیرہ ہے۔ اب اگر معاشرے میں مساوات ہو تاجر اور مزدور برابر ہوں غریب کو اس کی محنت کا صلہ ملے تو اس میں کیا برا ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔رضیہ سجاد ظہیر کا چوتھا ناول **"اللہ میگھ دے" 1973** میں شائع ہوا یہ ان کا آخری ناول ہے۔ اس کے بعد ان کا کوئی ناول مکمل شائع نہیں ہوسکا۔ **"دیوانہ مرگیا"** کے نام سے انہوں نے ایک ناول لکھنا شروع کیا لیکن پھر اپنی بیماری کی وجہ سے اسے مکمل نہ کرسکی۔شوہر کی وفات کے بعد وہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگی تھیں اور انہیں بیماریوں نے بھی گھیر لیا تھا۔

"اللہ میگھ دے" نامی ناول کا زمانہ 1960 کا لکھنو شہر کا دور ہے۔جس میں بہت شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ہوا یہ کہ اکتوبر کے مہینے میں خوب بارشیں ہوئی جن کے نتیجے میں لکھنو میں سیلاب آ گیا۔ نہال سنگھ اور اس کے دو دوست بوس اور امتیاز سکندر باغ بند جا کر جانچ کرتے ہیں جس پر پتا چلتا ہے کہ پانی بڑھتا رہا تو بند ٹوٹ جائے گا۔سیلاب کی تباہ کاری کے پس منظر پر لکھا گیا یہ ناول نئی نسل کا مثبت کردار اجاگر کرتا ہے۔رضیہ ظہیر نے روس انگلینڈ اور پاکستان وغیرہ کا سفر کیا۔ 40 سے زیادہ کتابوں کے تراجم کیے۔1966 میں انہیں نہرو ایوارڈ دیا گیا۔رضیہ سجاد ظہیر طویل علالت کے بعد اٹھارہ دسمبر 1979 کو دہلی میں انتقال کرگئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئی۔

☆☆☆☆

رضیہ فصیح احمد

رضیہ فصیح احمد کے والد کا نام وقیع احمد اور والدہ کا نام نفیس تھا۔ان کی پیدائش یکم ستمبر 1934ء ہے۔ان کا آبائی شہر مراد آباد ہے۔ جہاں ان کے دادا، دادی، نانا، نانی رہتے ہیں۔ان کے والدین کے گھر بارہ بچوں نے جنم لیا۔ان کے ابا ریلوے کے انجینئرنگ کے شعبہ میں کام کرتے تھے۔اس لیے والد کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ان کا گھرانا 1948 میں کراچی پاکستان آ گیا۔اس وقت وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔جیکب لائنز کے اسکول میں داخلہ ہوا۔جو نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔

ایف اے کے بعد اپنے تایا زاد بھائی سے شادی ہوگئی۔جو فوج میں افسر تھے۔رضیہ نے ہر امتحان میں پہلی پوزیشن اور شادی کے بعد ایک بچے کے ساتھ بی اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 1965 میں ناول ''آبلہ پا'' چھپا جس کو آدم جی ایوارڈ ملا۔اس وقت رضیہ احمد شکاگو میں مقیم ہیں۔

ناول سے ایک اقتباس:

"تو یہ ہوٹل والی کیا سوچیں گے کہ شاید ہم اس ہوٹل کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ "
مجھے کچھ غصہ سا آ گیا۔
"بابا اگر وہ یہ سوچتے ہیں تو سوچنے دیں ! کیا فرق پڑتا ہے۔ " بابا پھر ہنس پڑے۔
"میرا خیال ہے اب تم واقعی مجھ بڈھے کے ساتھ رہ رہ کر تھک گئی ہو۔ چند دن کے لیے اپنی خالہ کے پاس کراچی چلی جا۔"
"اچھا''۔میں نے کہہ دیا حالانکہ مجھے خالہ کے پاس جانے کا کوئی بھی شوق نہیں تھا ان کی لڑکیاں مجھے نری احمق سمجھتی تھیں۔ان میں سے ہر ایک دن میں کئی مرتبہ یہ فقرہ دہراتی۔
"اگر ہمارے ڈیڈی کے پاس اتنا روپیہ ہوتا جتنا جینی کے بابا کے پاس ہے تو ہم سچ مچ عیش کرتی۔ پر یہ جانے نہ جانے کون بوڑھی روح ہے۔ بابا نے میری ملازمت کے بارے میں پھر

کچھ نہ کہا۔ جس سے میں سمجھ گئی کہ وہ اس کے حق میں نہیں۔اب میرے لیے کیا تھا صبح سے شام تک بالکونی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنا، نیچے عورتوں اور بچوں کا شور خاموشی سے برداشت کرنا اور کبھی کبھی بیروں کو چوری چوری کوئی چیز تیزی سے اپنے کوارٹروں کی طرف لے جاتے دیکھنا سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے بوبی سے دوستی گانٹھی۔اس کو دیکھ کر میری بوریت ایک دم ختم ہو جاتی تھی وہ اتنا چونچال تھا کہ اسے دیکھ کر خود بھی چستی کا احساس ہوتا تھا۔رفتہ رفتہ وہ میری بلانے پر میرے پاس آنے لگا اسے دوستی کرنے کے لیے میں اس کے لیے ٹوفیاں، چاکلیٹ بہت سے کھلونے اور رنگ کرنے کی ایک کاپی اور رنگین پنسلوں کا ڈبہ لے آئی۔وہ میرے پاس بیٹھ کر تصویروں میں اول جلول سے رنگ بھرتا اور قہقہے لگاتا۔معصوم زندگی سے لبریز قہقہے میں اسے یہ چیزیں لے جانے نہ دیتی۔نہ جانے اس کا باپ کیا سوچے اور وہ یہ چیزیں پا کر بھی میرے پاس آئے یا نہ آئے۔اس میں میری خودغرضی بھی شامل تھی۔اپنے ڈیڈی کی وہ ہمیشہ تعریف کرتا، اپنے نئے کھلونے اور کپڑے وہ مجھے ہلا کر ضرور دکھاتا اور جب پوچھو تمہاری ممی کہاں ہے؟ تو بڑی بے پروائی سے کہتا "پتہ نہیں" کہہ کر کھیل میں مشغول ہو جاتا۔شاید اتنی اچھی ڈیڈی کو پا کر اس نے کبھی ممی کی کمی یا ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔وہ ہمیشہ انگریزی ہی میں بات کرتا میں اس سے اردو بولتی تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا کہ اسے اردو برائے نام آتی ہے۔ایک دن میں بازار گئی تو اس کے لیے قاعدہ لائی۔ ابھی ہمارے ہاں کے قاعدے ایسے نہیں ہوتے کہ جھٹ سے بچوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔خراب کتابت وطباعت، بے ڈھنگی سی تصویروں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے اس کے لیے ٹافی کا ایک پیکٹ بھی خریدا اور روز دو ایک حرف اسے پڑھانے لگی۔پھر ایک دن جب بوبی کے پیچھے تقریبا تمام ہوٹل کے بچے میرے کمرے میں چلے آئے تھے۔ میں نے ان سب کا امتحان لیا۔ بچے جو فرسٹ، سیکنڈ سٹینڈرڈ میں پڑھ رہے تھے، بمشکل اردو پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ عارضی طور پر یہاں رہنے کے سبب ان میں سے کوئی بھی آج کل اسکول نہیں جا رہا تھا۔مائیں ان کو پڑھنے کا حکم دے کر رمی کھیلنے کسی ایک کے کمرے میں اکٹھی ہو جاتی تھی۔اور یہ سارے میں اودھم مچاتے پھرتے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ پڑھنا چاہیں تو میں روز تھوڑی

دیر پڑھا سکتی ہوں ۔انہیں معلوم تھا کہ بوبی کو پڑھائی کے بدلے کھلونے اور رنگ کے ڈبے بھی ملتے ہیں۔اس لیے وہ مجھ سے پڑھنے کو آمادہ ہو گئے ۔اب صبح کے وقت میرا کمرہ آٹھ دس بچوں کی موجودگی میں باقاعدہ کلاس سے کم نہ لگ رہا تھا۔ مجھے ان کے اردو پڑھنے کے بدلے میں کچھ نہ کچھ دینا بھی پڑتا۔ان کے والدین اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار تھے۔ان میں سے اکثر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سب بچے میرے کمرے میں اکٹھے ہو کر کھیلتے ہیں ۔ایک شام جب میں سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔وہی گہری سیاہ آنکھوں والا لڑکا اپنے کمرے سے نکلا۔میرے برابر پہنچ کر مجھے سلام کیا اور بولا:

"میں کئی دن سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا"

" کس بات کا" میں نے بغیر رکے پوچھا۔

"آپ بوبی کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرتی ہیں۔اشرف مجھے بتا رہا تھا کہ آپ اسے کہانیاں سناتی ہیں اور اردو بھی پڑھاتی ہیں۔"

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں۔ ورنہ اشرف نامعلوم سے کہاں کہاں لیے پھرتا۔"

"اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں میں خود بور ہوتی تھی۔تھوڑی دیر بچوں کے ساتھ دل بہل جاتا ہے۔"

ہم نیچے پہنچ گئے تھے۔وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لان میں پہنچ کر بولا:

"اجازت ہو تو تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھ جاؤں۔"

میں نے کسمسا کر ادھر دیکھا اور کہا بیٹھ جایئے۔"

ہم دونوں بیٹھ گئے میرے ہاتھ تیزی سے سوئیٹر بننے میں مصروف تھے اور میں شیشے کی دیوار کے پیچھے سرخ مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ان میں سے کچھ بے سود سطح آب پر پڑی دکھائی دیتی

تھیں۔جیسے چنار کے سوکھے ہوئے پتے پڑے ہوں۔ میں سوچنے لگی یہ مچھلیاں شیشے کے آر پار زندگی کی چہل پہل کو دیکھ سکتی ہیں۔انہیں بہترین خوراک اور ہر قسم کا آرام میسر ہے،مگر مچھوں اور بڑی مچھلیوں کا خوف نہیں پھر بھی وہ قید میں ہیں۔اس زندگی سے مطمئن تو نہیں ہوں گی ان کی زندگی میں سمندر کی بے کراں وسعتیں جو نہیں ہیں اگر یہ شیشے کی دیوار ٹوٹ جائے پانی بہہ جائے تو وہ سبزے پر سسک سسک کر دم توڑ دیں۔ یہ قید ہی ان کی زیست کا بہانہ ہے شاید یہ فطری اور خود ساختہ پابندیاں ہی انسان کی زندگی کا بھی بہانہ ہے۔اگر یہ نہ ہوا انسان ایک دوسرے کو نوچ کر کھا جائے میں نے محسوس کیا وہ لڑکا مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میرے ہاتھ کانپے۔

"آپ کیا بنتی رہتی ہیں"؟اس نے پوچھا۔

"بس کچھ نہ کچھ بنتی رہتی ہوں۔ مجھے بننا اچھا لگتا ہے"۔

"آپ تھکتی نہیں۔میں دیکھتا ہوں آپ کچھ پڑھتی ہیں تب بھی آپ کے ہاتھ چلتے رہتے ہیں۔"

"بعض دفعہ تھک جاتی ہوں۔چھوڑنا چاہتی ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتی۔ایک دفعہ سلائیاں اور وہ میرے ہاتھ میں آجائیں تو جیسے چپک کر رہ جاتی ہیں"۔

"آپ تخلیقی قوت کی مالک معلوم ہوتی ہیں۔"

"میں اچھی پینٹنگ نہیں کر سکتی۔لکھ نہیں سکتی۔جب کوئی چیز شروع کرتی ہوں تو مجھے اس کو ختم کرنے کا اتنا ہی شوق ہوتا ہے۔جتنا کسی مصور یا افسانہ نگار کو اپنی تخلیق ختم کرنے کا۔"

"میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟"اس نے قدر جھجک کر کہا۔

" کیا آپ کسی دوسرے کی شروع کی ہوئی چیز کو بھی اسی تندہی سے تکمیل کو پہنچا سکتی ہیں"۔

مجھے یہ سوال بہت عجیب سا لگا یہ سوال اس کے ذہن میں کیوں آیا۔" کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔"

میں نے کہا " کہ کسی دوسرے کی چیز کو میں نے ہاتھ میں لیا ہو شاید اگر وہ میری پسند کے مطابق ہو تو میں اسے اسی تندہی سے مکمل کر دوں۔"

یہ ناول 1964 میں تحریر کیا گیا۔ اردو کا سب سے بڑا آدم جی ایوارڈ اس ناول کو دیا گیا ہے اور اس آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول میں معاشرتی تضاد اور عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسانی عظمت کے حصول کی خاطر انسان جو جدوجہد کرتا ہے۔ اس کا ناول میں بیان موجود ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک صبا نام عورت ہے۔ جو کہ حساس مگر باشعور لڑکی کا کردار ہے۔ اس کی ملاقات ایک ہوٹل میں اسد نامی ایک عیاش اور شاطر قسم کے شخص سے ہوتی ہے۔ ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ مگر مزاج میں تضاد کے باعث دوری ہو جاتی ہے۔ اسد ایک اور روبینہ نام کی ایک عورت سے محبت کرتا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، وہ صبا کو طلاق دینا چاہتا ہے۔ اسد ایک بوبی نامی لڑکے کو بھی اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ جو کہ ایک امریکی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔ مگر بعد میں جب اسے یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ بوبی کسی اور کا بیٹا ہے۔ تو وہ بوبی کو قتل کر کے خود گرفتار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف صبا اسد سے طلاق لے کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے اور بڑی جدوجہد کرتی ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں عورتوں کے اندر جو قناعت، صبر، تحمل اور قربانیوں کا جذبہ ہے اس کو بڑا سراہا ہے۔ یہ ہی ناول کا موضوع ہے۔ ناول کو تین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مرکزی کردار صبا کی زبانی سے کہانی بیان کرتا ہے۔ اس سے سبق کی شخصیت اور اس کا کردار بھی ہمارے سامنے واضح ہوتا ہے۔ ناول کی اہم بات یہ ہے کہ یہ کہانی کا بیانیہ انداز ہے مگر بیان کرنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ ناول کے دیگر نسائی کرداروں کی پیشکش میں مصنفہ نے خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ عذرا نامی کردار خاموش، خوش مزاج اور پرامید کردار ہے۔ یہ ناول زندگی کی حقیقی جیتی جاگتی تصویر سامنے لاتا ہے۔ سماجی برائیوں کے عکاسی کرتا ہے اور اسی بنا پہ ہم اس ناول کو مصنفہ کی بہتری تخلیق قرار دے سکتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد اردو ادب کی ایک ممتاز ناول نگار ہیں، جنہوں نے کئی اہم ناول لکھے، جن میں ان کا پہلا ناول "آبلہ پا" (1962) خاص طور پر مشہور ہوا۔ انہوں نے "صدیوں کی زنجیر"، "انتظار موسم گل"، "بے سمت مسافر"، اور "متاع درد" جیسے ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں تانیثی تناظر اور سماجی موضوعات نمایاں ہیں۔

☆☆☆☆

زاہدہ حنا

زاہدہ حنا پانچ اکتوبر 1946ء کو سہسرام ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام محمد ابوالخیر تھا اور والدہ کا نام شمس النسا تھا۔انہوں نے 1951 سے 1958 تک گھر میں والد کے زیرِ نگرانی انگریزی ، فارسی ،ریاضی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔1962 میں انہوں نے میٹرک کیا۔ 1966 میں اسلامیہ کالج فار ویمن کراچی سے گریجویشن کیا۔ان کے اجداد فرنگیوں کے خلاف جدو جہد کرتے رہے اور یہی اثرات زاہدہ حنا کی تحریروں میں بھی آئے ہیں۔وہ ایک بے باک صحافی ،کالم نگار،افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ 1970 میں ان کی شادی مشہور شاعر جون ایلیا سے ہوئی جن سے ان کے تین بچے ہوئے۔افسوس کہ یہ شادی چل نہ سکی۔ان کی لکھی ہوئی تحریروں کے،افسانوں کے تراجم کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔زاہدہ لکھتی ہیں:

"عورت ہونا، کہانیاں لکھنا ،اختلاف کرنا ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں انہی کا مجموعہ ہوں۔وہ کہتی ہیں میرے وجود کی ترکیب میں مغل ،عرب اور پٹھان عناصر شامل ہیں۔دنیا کے تمام خاندانوں کی طرح میری خاندانی داستان بھی ہجرت سے عبارت ہے۔"

انہوں نے دو ناول "درد کا شجر" اور "دردِ آشوب" تحریر کیے ہیں۔وہ کراچی میں مقیم ہیں۔

☆☆☆☆

زبیدہ خاتون

زبیدہ خاتون ایک پاکستانی اردو ناول نگار ہیں۔جن کی والدہ اے آر خاتون بذات خود ایک ناول نگار رہی ہیں۔زبیدہ خاتون اور اے آر خاتون کے لکھے ناولوں پر کئی پاکستانی سیریل اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ انھوں نے 1967 میں اپنی والدہ کی شروع کردہ ناول "فاکہہ" مکمل کیا تھا۔انہوں نے ناول ''نہالہ'' کو اپنے والدہ کے نام انتساب کیا ہے۔ناول ''نہالہ'' سے ایک اقتباس:

> "جب سے بڑی بھابی جان اور نواب صفدر یار جنگ اپنے بیٹے سرور یار جنگ کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئی تھیں۔انہوں نے دونوں میاں بیوی کی باتوں ہی سے اندازہ لگا لیا تھا جیسے وہ صرف بیٹے کی خواہش پر مجبوراً لڑکی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔اپنے خوشی کا تو ذرا بھی اظہار نہ کیا۔ بڑی بھابی جان تو ایسا لگتا تھا۔جیسے خفا بیٹھی ہوں ان کی طرف سے وسیمہ بھابی وکالت کر رہی تھی۔"

زبیدہ خاتون کا ناول "ہما" دلچسپ اور معاشرتی شاہکار ہے۔ اس میں ایک بچی کے کمسنی میں گم ہو جانے اس کے باپ کا دماغی توازن کھو جانے اور بچی کا دردر ٹھوکریں کھانے کا احوال ہے۔ جس طرح اس بچی نے زمانے کے نشیب وفراز دیکھے۔امتحانی دور سے گزر کر پاکیزہ محبت کے آغوش میں پناہ لی۔ اس کی زندگی کے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات اس ناول میں بیان کیے گئے ہیں،اس ناول کا انتساب انہوں نے پڑھنے والوں کے نام کیا ہے۔

ناول سے ایک اقتباس:

"بیچاری دلہن کی خالہ بدقسمت عورت نکلی۔اس دن اس کالی بلی کا دودھ دان توڑنا کوئی یونہی تو تھانہیں، بیچاری مجھے بہت سمجھا رہی تھی کہ ایسا فضول باتیں ہیں ان سے کچھ نہیں ہوتا۔اب دیکھ لو اس دن کیسے بدشگونی ہوگئی تھی مگر ان پر سب کچھ پڑ گیا۔مانتی ہی نہ تھیں کہ شگون کوئی چیز ہوتی ہے ۔منصورہ بیگم نے غائبانہ طور پر بیگم رضا کو قائل کرنا چاہا۔"

ان کے ناول "عروسہ" کو 1992 میں فاطمہ ثریا بجیا نے ڈراما میں تبدیل کیا تھا۔اسی طرح ,کرن نامی ڈراما ان کے تحریر کردہ ناول پر پی ٹی وی لاہور کی جانب سے 1993 میں بنایا گیا۔زبیدہ کی تحریریں شعاع ،کرن ڈائجسٹ اور حنا حجاب ،ڈائجسٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں اور مقبول ہو چکی ہیں۔ان کے لکھے ہوئے ناولوں میں نادرہ،عروسہ کرن، ہما،ترنم،نہالہ، ماہم وغیرہ ہیں۔

☆☆☆☆

زلیخا حسین

زلیخا حسین یکم جنوری 1930 میں کوچی مٹان چیری کے میمن خاندان میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام احمد سیٹھ اور والدہ کا نام مریم بائی تھا۔والد سیاسی اور سماجی حلقوں میں بہت سرگرم تھے۔ان کے محمد علی جناح سے نزدیکی تعلقات تھے۔وہ علامہ اقبال سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے انتقال کی خبر سن کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔زلیخا حسین کمسنی میں ہی والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئی تھیں۔ان کے نانا جان جانی سیٹھ کے زیر سایہ ان کی پرورش ہوئی۔جانی سیٹھ کیرالہ کی نامور اردو ہستی تھے۔وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے اور شوخ کے زیر تخلص شاعری کرتے تھے۔شاعری میں وہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔جانی سیٹھ اور ستار سیٹھ نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر اصلاح السان نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔یہ تنظیم کیرالہ میں اردو کے فروغ میں سرگرم کردار ادا کرتی تھی۔اس تنظیم کے تحت نرجیلستان کے نام سے ایک میگزین بھی شائع ہوتی تھی۔

جانی سیٹھ کی نگرانی اور سرپرستی میں زلیخا کی تعلیم و تربیت بہت معقول طریقے سے ہوئی۔انہوں نے چوتھے درجے تک مٹان چیری کے مدرسہ آسیہ بائی میں عربی تعلیم حاصل کی۔انہیں اردو کی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے حیدر آباد کے رضوان اللہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔اس دور میں کہ جب کیرالہ میں مسلم خواتین گھر کی چہار دیواری میں رہا کرتی تھیں زلیخا حسین نے گریجویشن تک کی تعلیم حاصل کی۔

1970 میں انہوں نے اپنا مشہور ناول **"تاریکیوں کے بعد"** لکھا۔اس کا ترجمہ ملیالم زبان میں بھی ہوا ہے۔1990 میں زلیخا حسین نے ناول **"ایک پھول اور ہزار غم"** لکھا جس میں پہلی بار اپنا پتہ لکھا اور تصویر بھی شائع کی۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش اور خلیجی ممالک میں بھی زلیخا حسین کے ناول بہت مقبول ہوئے۔ زلیخا حسین نے نہایت سادہ،شفاف اور سلیس انداز میں اپنے ناول کے کرداروں کے جذبات بیان

کئے ہیں۔''آدمی اور سکے'' ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے صدمات سے دوچار ایک خاتون کی ذہنی کیفیت بیان کی ہے۔

"اس کی باتیں سن کر زاہدہ کا سر چکرانے لگا۔آنکھوں کے سامنے اندھیارے ناچنے لگے۔ اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔طوفان اٹھنے لگے۔وہ سکتہ کے عالم میں پتھر کی بنی چپ چاپ بیٹھی رہی۔اس کے اعضا جیسے حرکت کرنے سے جواب دے گئے۔جس گھر میں وہ دلہن بن کر آئی تھی۔ زندگی کے تین سال بڑے عیش وعشرت کے ساتھ گزارے تھے۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا۔وہ اس کے سیاہ وسپید کی مالک تھی۔شوہر کی آنکھ بند ہوتے ہی اس نے سنا کہ اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں۔ غیر کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر چھ ماہ سے یہاں ڈٹی ہوئی تھی۔اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو اپنی عدت کے دن بھی اپنے بابا کے یہاں گزارتی۔وہ ایک غیور عورت تھی۔اس کی غیرت کا اب یہ تقاضہ تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہاں سے چلی جائے۔خط ملتے ہی نظام اسے لینے آگئے اور وہ روتی ہوئی منے کو لے کر بابا کے یہاں آگئی۔"

"روح کے بندھن" ناول ایک ایسے چھوٹے سے خاندان کی دردناک کہانی کے اردگرد گھومتا ہے جس میں ایک اپاہج باپ ہے۔ ایک بیٹی ہے اور گھر کے اخراجات کے لئے دن رات محنت کرنے والی ایک خاتون ہے۔ہر غربت زدہ لڑکی کے کم وبیش یہی جذبات ہوتے ہیں جن کو زلیخا حسین نے بیان کر دیا ہے۔

اپنی کلاس فیلو لڑکیوں کے ٹھاٹھ دیکھ کر اسے اپنی کم مائیگی کا ہمیشہ بری طرح احساس ہونے لگتا تھا۔بہت سی خواہشیں تھیں،رمان تھے،جو دل میں گھٹ کر رہ جاتے تھے۔وہ کس سے کہے۔ایک ماں کی کمائی سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔اس کی پڑھائی کا خرچ۔آئے دن روگی باپ کے علاج معالجہ کا خرچ۔اس کی ماں اپنے کمزور کندھوں پر یہ سارے بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں۔ماں سے وہ اپنی کسی دلی خواہش کا اظہار کر نہیں سکتی تھی۔یہ دوسری بات تھی کہ ماں خود اپنی حیثیت کے مطابق اس کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔کاش میرا باپ کسی قابل ہوتا۔جب بھی اسے یہ خیال آتا۔لاشعوری طور پر اس کے دل میں اپنے اپاہج باپ کے خلاف سخت بیزاری کے جذبات جنم لینے لگتے۔

زلیخا حسین اردو کی ایسی فکشن نگار ہیں جنہیں کیرالہ کی پہلی اردو ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ زلیخا حسین نے درجنوں ناول اور افسانے لکھے جو ہندستان کے ساتھ ساتھ پاکستان، بنگلہ دیش اور خلیجی ملکوں میں بھی مقبول ہوئے۔ ان کے کچھ ناولوں پر ملیالی زبان میں فلمیں بھی بنیں۔ زلیخا کی متعدد تخلیقات کا ملیالی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ زلیخا حسین نے 20 سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول ''میرے صنم'' لکھا تھا۔

زلیخا حسین کی ادبی خدمات اس پہلو سے بھی اہم ہیں کہ وہ کیرالہ میں دیگر مذاہب اور زبانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے اندر ادبی ذوق پیدا کرنے کا وسیلہ بنیں۔ زلیخا حسین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملیالم اور انگریزی زبان میں لکھنے والی خواتین کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے عالمی پیمانے پر کیرالہ کی نمائندگی کی۔ سارہ ابوبکر، کملا داس (کملا ثریا) اور خدیجہ ممتاز جیسی متعدد اہل قلم نے نہ صرف نسائی معاملات کو اٹھایا بلکہ اپنے اپنے انداز میں عوامی مسائل پر دنیا کی توجہ مبذول کرائی۔ زلیخا حسین کی ناول نگاری پر اردو اسکالر شکیلہ نے 2016 میں پی ایچ ڈی کی۔ زلیخا حسین کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ وہ آخری دم تک وزارت ثقافت کے تحت مرکزی اردو فیلوشپ کمیٹی کی رکن رہیں۔ ان کو حکومت کیرالہ اور انجمن اساتذہ اردو کیرالہ نے بھی متعدد اعزازات سے نوازا۔ 1997ء میں اپنے شوہر حسین سیٹھ کی ناوقت موت اور گھریلو مسائل کے باوجود زلیخا حسین ادبی خدمات انجام دیتی رہیں۔ 27 ناول، 8 مختصر ناول اور درجنوں افسانوں کی شکل میں ادبی سرمایہ چھوڑ کر زلیخا حسین نے 15 جولائی 2014 کو اس دنیا کو چھوڑا۔

☆☆☆☆

سارہ ابوبکر

سارہ ابوبکر 1936ء میں پیدا ہوئی۔وہ معروف بھارتی کناڈا زبان کی ناول نگار، افسانہ نگار اور مترجم تھیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں ساحلی کرناٹک کے مسلمانوں، خاص طور پر خواتین کے سماجی مسائل اور صنفی عدم مساوات کو اجاگر کیا۔کاسرگوڈ میں پیدا ہونے والیسارہ ابوبکر نے کنڑ ادب میں اہم خدمات انجام دیں۔ان کی تحریریں ہندوستانی ادب میں، خاص طور پر علاقائی زبانوں میں خواتین کی آواز کو بلند کرنے کے لیے اہم سمجھی جاتی ہیں۔

کناڈا ناول "چندرگیریا تیرادلی (Chandragiriya Teeradalli) "ہے جو 1981 میں شائع ہوا۔انگریزی میں اس کا ترجمہ "Breaking Ties" کے نام سے کیا گیا۔یہ ناول ساحلی کرناٹک اور کیرالہ کے مسلم معاشرے میں خواتین کی حالتِ زار کی عکاسی کرتا ہے۔

اس ناول کی کہانی ایک نوجوان مسلم لڑکی کے گرد گھومتی ہے۔نادرہ کا شوہر رشید غصے میں آ کر اسے طلاق دے دیتا ہے۔ بعد میں پچھتاوے کے بعد جب وہ دوبارہ شادی کرنا چاہتے ہیں، تو مقامی روایات کے تحت نادرہ پر نکاحِ حلالہ کی شرط عائد کی جاتی ہے۔نادرہ اس روایتی اور ذلت آمیز عمل کو اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھ کر مسترد کر دیتی ہے۔وہ مردانہ بالادستی اور سماجی دباسے تنگ آ کر چندرگیری ندی میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔سارہ ابوبکر نے ٹی وی ایچاراواریئر، کملاداس اور بی ایم سہارا کی کناڈا کی کتابوں میں ترجمہ کیا ہے۔آپ نے 2023 میں وفات پائی۔

☆☆☆☆

سلمیٰ اعوان

سلمیٰ اعوان 1943ء میں لاہور میں پیدا ہوئی اور لاہور ہی میں مقیم ہیں۔ناول نگار،افسانہ نگار،سفر نامہ نگار،مترجم اور نقاد سلمیٰ اعوان کی ادبی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔انھوں نے ان مختلف جہات میں قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیے ہیں۔سلمیٰ اعوان ان معدودے چند لکھاریوں کی صف میں شامل ہیں جو بیک وقت خواص اور عوام میں مقبولیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں ناقدین سے تو تحسین حاصل کرتی ہی ہیں۔لیکن ڈائجسٹوں اور اخباروں کی بھی زینت بنتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاصر لکھاریوں کی نسبت ادب کے عام قارئین میں کہیں زیادہ مقبول ہیں۔

ان کی تصانیف کی فہرست اور تخلیقی کام کا حجم دیکھ کر ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔زود نویس لکھاریوں کے ہاں عموما ناہمواری ہوتی ہے۔ان کی بعض تحریریں بہت بلند اور بعض بہت پست ہوتی ہیں۔لیکن سلمیٰ اعوان نے ایک معیار برقرار رکھا۔

سلمیٰ اعوان کے مشہور ناولوں میں " تنہا" ہے جو سابق مشرقی پاکستان/بنگلہ دیش کے پس منظر پر لکھا گیا ایک شاہکار ناول ہے۔" شبیہ "،" زرغونہ "،" خوشبو کا سفر "،"اک تارا پیاسا" ہے۔

ناول " زرغونہ " سے اقتباس:

> "اسی لیے تو میں کہتا ہوں بیٹے اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے یہ عورتوں کے کام ہیں اور انہیں ہی زیب دیتے ہیں تو کیوں نہیں میری بات کو سمجھتا کتنی خواہش ہے، کتنی آرزو ہے میری کہ وہ وقت جلد آجائے۔ جس کی تمنا میں ایک عرصے سے کر رہا ہوں"۔لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔"

وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ لاہور میں ایک تعلیمی درسگاہ ان کے زیر انتظام بہت کامیابی سے کام کر رہی ہے۔ شاید یہ نئی نسل سے ان کی قربت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور تازگی کی فراوانی محسوس ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو ان کا اسیر کر دیتی ہے۔

ناول ''شبیہہ'' سے اقتباس:

"وقت ہواں کی دوش پر اڑ رہا تھا شبیہہ کو گاں ائے تقریبا دو ماہ ہو رہے تھے عمر 15 دن رہنے کے بعد واپس چلا گیا تھا اور اب وہ خود بھی جانے کے لیے پر تول رہی تھی کتنے کتابیں اور نوٹس لائی تھی اس امید پر کہ وہاں سکون سے پڑھ سکے گی۔ لیکن حال یہ تھا کہ ایک دن بھی جم کر نہ پڑھا جاسکا اب وہ جلد از جلد لوٹ جانا چاہتی تھی، لیکن مصیبت تو یہ آن پڑی کہ دادی اماں اسے تنہا بھیجنے پر رضامند نہ تھی اور گھر میں کوئی ایسا مرد نہ تھا۔ جو اس کے ساتھ جا سکتا دن گزرتے جا رہے تھے دادی اماں کے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکتی لیکن اسما کے سامنے پگھل اٹھتی۔"

سلمی اعوان کا فکشن پاپولر فکشن اور ادب جدید کا امتزاج سا ہے انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز سے نوازا گیا ہے۔

☆☆☆☆

سلمیٰ صدیقی

سلمیٰ صدیقی 18 جون 1931 کو وارنسی، بنارس، ہندوستان میں پیدا ہوئیں آپ تحریک ترقی پسند مصنفین میں شامل رہیں۔آپ کے والد راشد احمد صدیقی تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور مزاح نگار بھی تھے۔سلمیٰ صدیقی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی، انہوں نے اردو ادب میں ایم اے کیا اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ان کی پہلی شادی خورشید عادل منیر سے ہوئی تھی۔ان کا ایک بیٹے راشد خورشید منیر بھی ہے۔ان کی پہلی شادی نہ چل سکی تو انہوں نے دوسری شادی کرشن چندر سے اسلامی طریقے پر کی۔اور وہ دونوں بمبئی میں رہنے لگے ۔ان کا ناول سکندر نامہ بہت مشہور ہوا ہے۔

سلمیٰ صدیقی نے حقوق نسواں سے متعلق اردو اور ہندی میں افسانے لکھے۔انہوں نے طنزیہ مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے وہ رپوتاژ سے بھی لگاؤ رکھتی تھی۔

انہوں نے ناول " سکندر نامہ " اپنے والدہ کے نام انتساب کیا ہے۔

ناول سے ایک پیرا گراف:

"بات چیت کے دوران سکندر کو محاورے بولنے کا بڑا شوق ہے مثلا مجبوری کا نام شکریہ کاش خدانخواستہ یہ دنیا آنی کانی ہے، بد اچھا گمنام برا۔ان کا سب سے دلچسپ قول تو یہ ہوتا ہے۔

" قبر کا حال تو مردہ جانے، زندہ ہم کیا جانے۔"

سکندر کو حادثوں سے بھی بڑی دلچسپی ہے لیکن چھوٹے موٹے حادثے جس میں کسی کو جانی یا مال کا نقصان نہ پہنچے اسے بالکل نہیں بھاتے ہیں۔سکندر کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے دہلی میں انہوں نے ایک سردار سے دوستی کر لی تھی۔اس کے ساتھ باہر آتے جاتے تھے۔ایک دن

بہت شام گئے تک بھی نہ لوٹے تو مجھے فکر شروع ہوئی آخر میں اٹھ بجے رات کو سکندرا کیلے گھر لوٹے
میں نے انہیں ڈانٹا کہ

"اتنی دیر تک کہاں غائب رہے سارے کاج چھوڑ کر"

بولے "ارے صاحب کیا بتائیں آج کیا قصہ ہو گیا۔"

ناول سکندر سلمی صدیقی کے گھریلو ملازم کے کہانی ہے جس کا نام سکندر رہے۔انہوں نے پھنیشورناتھ رینو کے ناول کا ترجمہ **"میلا آنچل"** کے نام سے کیا ہے۔یہ ہندی ناول کا اردو ترجمہ ہے یہ ناول مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں اس کا کینوس پورینا ہے جو صوبہ بہار کا ضلع ہے۔سلمی صدیقی کا انداز تحریر برجستہ ہے، رواں ہے سادہ اور سلاست زدہ انداز تحریر ہے۔

وہ 13 جنوری 2017 کو انتقال کر گئی۔

☆☆☆☆

سلمیٰ کنول

سلمیٰ کنول 1933 میں پیدا ہوئی۔ لاہور میں مقیم رہی تھی۔ وہ میرے افق کا آنچل کی مدیرہ رہی۔ ناول نگاری کے میدان میں 60 کی دہائی میں سلمیٰ کنول نے 40 ناول لکھے۔ بہت زیادہ شہرت حاصل کی ان کے کئی ناولز پر ڈرامے بھی بنے۔

سلمیٰ کنول کے ناولز میں ایک اہم ناول "وادیوں کی آہیں" ہے۔ جس کی کہانی میں ہزاروں پیچ وخم ہیں ۔ ماضی وحال کے قصے ہیں۔ کہانی برق رفتاری سے آگے بڑھتی ہے۔ کہانی کے کردار کہانی کے تانے بانے کے لحاظ سے مختلف شخصیتوں کے نمائندے ضرور ہیں۔ لیکن غیر حقیقی نہیں ہیں۔ ہر کردار اور اس کی محرکات اس طرح حقیقت کے سائے میں پروان چڑھتے معلوم ہوتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان میں کھو کر رہ جاتا ہے سلمیٰ نے اپنے قلم کے جادو سے محبت کو وجد آفریں ماحول میں تسکین فراہم کی ہے۔ کسی معاشرے میں جنم لینے والی برائیوں کی گھناونی مگر حقیقی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اس دور کے ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں میں کہانی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ناول نگار مصلح اخلاق ہوتی ہے۔ ناصح اور مبلغ زندگی کے مشاہدات اور تجربات جو کچھ اسے دیتے ہیں وہی وہ کاغذ پہ بکھیر دیتی ہے۔ اس میں چاہے تلخ حقیقتوں کے عکس ہوں یا کچھ میٹھی یادیں۔ جن کے سہارے زندگی کی گھڑیاں گزار دینا انسانی فطرت ہے۔ وادیوں کی آہیں "پڑھ کر یہ حقیقتیں ذہن میں واضح ہوتی چلی جاتی ہیں یہی سلمیٰ کنول کی کہنہ مشقی اور قلم کا کمال ہے۔

وادیوں کی آہیں سے ایک اقتباس:

" تمہاری زندگی کے جوت سے تو میری حیات کا چراغ روشن ہے۔ جس روز تم نے آنکھیں پھیرلیں میری تمام ہستی بے نور ہو جائے گی۔ میں اندھیروں میں بھٹک جاؤں گی۔ ایک پل بھی

تو چین نہیں ملا۔ایک لمحہ کا قرار بھی تو نہیں ایا لیکن میں نے تو جس طرح بھی ہو سکا تمہارا انتظار کیا اور کر لوں گی۔تمہیں دنیا مبارک ہو۔تم آباد رہو۔ وش رہو، تمہاری خوشی تو میری خوشی ہے۔تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن 50 ہزار۔"

کنول کی ذاتی زندگی دکھوں سے عبارت رہی۔شادی کے بعد بیٹی کی صورت میں زندگی کا تحفہ ملا لیکن کم عمری میں ہی ان کی بیٹی خدا کو پیاری ہوگئی۔ یہ صدمہ ان کے لیے خاصا جان لیوا تھا۔پھر معذوری کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قاصر تھیں۔وہیل چیئر پر زندگی کے کئی سال بسر کیے۔یہی تلخیاں تھیں۔جنھوں نے انہیں گھر تک محدود کر دیا۔انہوں نے زندگی گزارنے کے لیے لکھنے پڑھنے کے شوق کا ہی سہارا لیا۔اسی کام میں پوری توانائی صرف کر دی۔

سلمیٰ کنول کے ناولوں میں ''آبرو''،''اکیلی''،''عندلیب''،''آصفہ''،''بہاروں پھول برسا''،''چپکے سے بہار آ جائے''،''بے نام''،"بے درد"،''گلنار''،"دشمن دامن"،''دکھ سکھ''،''دل کی چوکھٹ پر''،''دل ایک کشکول"،"لاڈلی"،''کنارہ"،"کشمکش"،"جذبہ دل"،''اس دیوانگی میں"،"نوازش"،"لالہ"، "لکیریں"، "پناہ گاہ"، "پتھر"، "سہاگن"، ''تیرے بنا"، "شعلہ"، ''صدف"، "صبا"، "وادیوں کی آہیں"، ''عروج"، "اجالا" وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔یہ ناول بہت مقبول ہوئے۔سلمیٰ کنول نے ناول ''لاڈلی'' اپنی بیٹی فاطمہ کنول کی یاد میں لکھا اور فاطمہ کنول کے نام انتساب کیا۔ناول "لکیریں" کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں۔"میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی زندگی بن کے چھپا بیٹھا ہے۔"

سلمیٰ کنول 2005 میں لاہور میں وہ انتقال کر گئیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سیمیں رخ

ڈاکٹر سیمیں رخ آئرلینڈ میں مقیم ہیں۔ڈاکٹر سیمیں رخ کے ناول اردو ادب خاص طور پر خواتین کے ڈائجسٹوں میں بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ان کی تحریریں سماجی مسائل، انسانی رشتوں کی نفسیات اور محبت کے گرد گھومتی ہیں۔ان کے چند مشہور ناول درج ذیل ہیں:

بادِسموم: یہ ان کا سب سے مشہور اور شاہکار ناول مانا جاتا ہے۔جس نے قارئین میں انہیں ایک سنجیدہ ناول نگار کے طور پر متعارف کروایا۔

"**کنعان**" ان کا حالیہ مقبول قسط وار ناول ہے۔جسے قارئین نے اس کے منفرد موضوع اور اسلوب کی وجہ سے بہت پسند کیا ہے۔"**دردِ مشترک**" ناول میں انسانی جذبوں اور سماجی دکھوں کو بڑی مہارت سے قلمبند کیا گیا ہے۔ناول "**ایک جہاں اور ہے**" سے اقتباس:

"یہ بنجر زمین تھوڑی ہے یہاں یادیں پنپتی ہیں۔محبت خوشبو دیتی ہے۔آنکھ سے شبنم گرتی ہے۔"

بس رک چکی ہے اپنا سانس مشکل سے سنبھالے میں نے اس روش پر قدم بڑھا دیے ہیں۔جس کے قریب، بہت قریب تمہاری قیام گاہ ہے۔وہ چٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔جس پر تم نے پتہ لکھ کر بھیجا تھا۔ایک ساتھی مسافر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جگہ بس سٹاپ سے زیادہ دور نہیں۔گو چلنا میرے لیے آسان نہیں لیکن میں اپنے قدموں پر آنا چاہتی ہوں تاکہ ایک ایک قدم مجھے تمہاری قربت کا احساس دلائے۔سانس بھاری ہونے کے باوجود یہ مسافت مجھے روئی کے گالے کی طرح ہلکی محسوس ہو رہی ہے۔بارش کی بوندیں اب بھی برس رہی ہیں میرا نیلا لباس بھیگتا چلا جا

رہا ہے۔کلائیوں کی روپہلی چوڑیوں پر کئی بوندیں آ کر ٹھہر گئی ہیں۔۔۔بس مجھے ڈر ہے کہیں آنکھوں کا کاجل نہ پھیل جائے۔ مجھے علم ہے کہ تم بے چینی سے میرے منتظر ہو گے۔تمہاری نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھتی ہوں گی اور بے قراری سے تمہارا دل کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتا ہوگا۔میرے ہاتھوں میں جو چٹھی ہے اس پر لکھائی تمہاری تو نہیں ہے پھر کس کی ہے کیا تم نے کسی اور سے خط لکھوایا ہے یا پھر ان برسوں میں تمہاری انگلیوں نے مختلف طریقے سے لکھنا سیکھ لیا ہے۔۔۔کئی موڑ مڑنے کے بعد شاید میں آ گئی ہوں۔تمہارے قریب سامنے ہی تو ہے۔۔۔ بارش میں بھیگی روشنی میں چھپی عمارت۔۔۔تو تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو دل ایک جھٹکا سا لیتا ہے۔۔۔سانس رکنے لگتی ہے بس اب میں تمہیں دیکھنے والی ہوں کیا کہوں گی تم سے۔۔۔کیا دیکھ کر رو دوں گی یا پھر شکوہ کروں گی کیا خاموشی سے تمہارے پہلو میں آ سماؤں گی؟"

ناول **"ایک جہاں اور ہے"** انسانی رشتوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈاکٹر سیمیں رخ پاپولر فکشن کی مد میں لکھتی ہیں۔ان کے ناول سلسلہ وار دوشیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور آج کل بھی ان کا ایک ناول دوشیزہ ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے جس کی مدیرہ منزہ سہام مرزا ہیں۔

☆☆☆☆

شاہدہ دلاور

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ 14 جولائی کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔شاہدہ دلاور شاہ ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور کے اردو شعبے کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں۔دلاور شاہ ایک ممتاز اردو ناول نگار،شاعرہ اوراسکالر ہیں۔ جن کا مشہور ناول **"زندگی ایک ناراض متن(Zindagi Ek Naraz Matan)"** ہے۔یہ ناول ہم جنس مراسم (مردانہ دوستی/ تعلق) کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

"زندگی ایک ناراض متن" ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا پہلا ناول اور جمیل احمد عدیل کے لکھے ہوئے دیباچے سے اقتباس:

"یہ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا پہلا ناول ہے۔اس سے پہلے ان کی شاعری،افسانہ،کالم اور ادبی مضامین پر مشتمل 15 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ناول موضوع اوراسلوب کے حوالے سے منفرد ہے۔ناول کا بنیادی کردار تو انعم کا ہے جسے ناول میں انو کہا گیا ہےمگر ناول کا بیانیہ ایک مرد کردار کا ہے۔جوخود بھی ناول کے کرداروں کا ایک کردار ہے۔مختلف وقتوں میں ایک ادارے میں کام کرنے والے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں جہاں دن کا کافی وقت ان کا ساتھ میں گزرتا ہے۔ مذہب کے مختلف ہونے کے باوجود اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے سبب باہم نفرتیں اور محبتیں جنم لیتی ہیں جو معاشرت اور کلچر پر بنیاد کرتی ہیں۔ناول کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ادارے میں کام کرنے والوں کے رشتے دار جب کہانی میں شامل ہوتے ہیں تو یہ ناول کے توسیعی کردار کے طور پر کہانی کا کینوس پھیلا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا بےخوف اورصداقت آمیز قلم نہایت بدلحاظ ہے۔وہ انعم کے بہنوئی اور بہن کے کردار کے تضادات اور منافقت کو اس بیرحمی سے سامنے لاتا ہے کہ قاری کچھ دیر کے

لیے گنگ ہو جاتا ہے۔

ناول کے کئی کردار کسی نہ کسی انجام کو پہنچتے ہیں۔مگر کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو ناول میں مہمان اداکار کی طرح ظاہر ہوتے ہیں اور پھر بساط سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ناول نگار نے یوں دیا ہے کہ ہماری حقیقی زندگیوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

ناول کی زبان بہت ہی شاندار اور ادب عالیہ میں فکشن کی زبان ہے۔ عام زندگی میں خاموش اور ثانوی کردار نبھانے والی ڈاکٹر شاہدہ دلاورشاہ ایسی باریک بین اور ان کا قلم ایسا تیز نشتر ہے۔اس کا اندازہ ناول پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔اس کے افسانوں میں زندگی کی بوقلمونیاں تو تھیں ہی مگر جو رچا ناول میں دکھائی دیتا ہے۔اور جس مہارت سے ناول کے کرداروں اور ان کے توسیعی کرداروں کو برتا گیا ہے۔یہ ہنر بہت تخلیقی صلاحیتوں کا متقاضی ہے۔ جسے ناول نگار نے پورے اعتماد سے برتا ہے۔مستقبل کا اردو ناول ڈاکٹر شاہدہ دلاورشاہ سے ایسے ہی اور شاندار ناول لکھنے کی امید رکھنے میں برحق ہوگا اور جو بہاؤ اس ناول میں ہے، مجھے ڈاکٹر صاحبہ کا قلم رکتا محسوس نہیں ہوتا"۔

ڈاکٹر شاہدہ دلاورشاہ کا دوسرا ناول " **سمے کا ساحل** " جدید تر اسلوبیاتی تیکنیک میٹا فکشن اور انٹر ٹیکسچوئلٹی میں لکھا ہوا ہے۔جو قاری کی بھرپور توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے بعد اپنی معنویاتی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔یہ تیکنیک قاری کی سنجیدگی اور استغراق کی متقاضی ہے۔ایسے ناول پر اظہار خیال بھی ایک مشکل کام ہے۔جو مابعد جدیدیت تنقیدی رویوں کو سمجھنے کے بعد ہی اپنی گہرائیوں میں اترنے دیتا ہے۔ یوں سمجھ لیں یہ منیر نیازی اور مجید امجد کی نظموں جیسا ہے۔اس ناول میں بھی ناول نگار نے اپنی الگ ڈکشن بنائی ہے۔

ناول کا عنوان " **سمے کا ساحل** " اپنے اندر ماجرے کی وقوع پذیری کی معنویت کا دعوے دار ہے۔ اس لیے کہ وقت کے بہاؤ کی طرح زندگی ناول میں اپنی حقیقی صورت میں رواں دواں ہے اور " ساحل " ایک ایسی حد بندی ہے جس سے ملحقہ سمندر ہوتا ہے۔ساحل ساکن ہے اور " سمے " بہ مراد سمندر کا پانی لہریئے لیتا،

کنارے سے سر ٹکراتا ہے۔ گویا ناول آپ کو سکونت اور بہا کی سرحد پر لا کھڑا کرتا ہے۔

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ نے اپنے ناولوں میں روایتی کہانی کو ڈی کنسٹرکٹ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ناولوں میں ہیرو جیسے مافوق الفطرت یا ماورائی کردار نہیں ملتے۔ یہ روایتی ناول کے ہیرو اصل میں آمریت کی یادگاریں ہیں۔ جہاں ایک ہیرو کے کردار کو مضبوط تر بنانے کے لیے بہت سے ثانوی اور کم اہمیت کے کردار اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ روایتی ناولوں کے برعکس ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کے ناولوں میں آمریت اور ہیرو پرستی کے بجائے جمہوریت کی پیش کش محسوس ہوتی ہے، جہاں افراد اور ان کی اجتماعی زندگی اہم ہوتی ہے۔ ہر فرد دیگر افراد کے متوازی یا مخالف زندگی اپنے پیرائے میں گزارتا ہے جس سے جمہوری معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ اجتماعی زندگی ہی جدید تر ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتی ہے اور بغیر کسی روایتی انجام کے ناول اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا تیسرا ناول **"غیر مطبوعہ جیون"** اردو ناول میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ اس سے قبل دو ناول منظرِ عام پر آ کر نہ صرف داد وصول کر چکے ہیں بلکہ ان کے پہلے ناول **"سمے کا ساحل"** پر پوسٹ ڈاکٹریٹ کی سطح کا تحقیقی مقالہ لکھا جانا کسی اعزاز سے کم نہیں۔ دوسرا ناول **"زندگی ایک ناراض متن "** بھی تعریف و تحسین سمیٹ رہا ہے۔ حال ہی میں ان کا تیسرا ناول شائع ہوا ہے۔ ان کے ناولوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھیں کسی ایک خاص موضوع کی طرف نہیں دھکیلا جا سکتا کیوں کہ اس ناول میں سماج کے بہت سے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی ان کے سابقہ ناولوں کی طرح کسی ایک خاص پہلو کو نہیں بلکہ معاشرے کے تمام اہم پہلوں کو اجاگر کرتا دیکھائی دیتا ہے۔ اس ناول کے کردار آپس میں بحث و مباحثہ کرتے، فلسفہ جھاڑتے دیکھائی دیتے ہیں کہیں طالب علم اپنے اساتذہ پر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی یہ ناول چھوٹی بحر کی کسی نظم کا تاثر پیش کرتا ہے۔ تو کہیں مکالمہ طویل ہو جاتا ہے۔ "غیر مطبوعہ جیون " فلسفہ، تاریخ ،تہذیب، مذہب تمام پہلوؤں پر بات کرتا۔ یہ ناول اپنی کہانی کی بنت اور ہیت کے لحاظ سے بھی ایک منفرد ناول ہے۔ اس کے کردار قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے کرداروں کی طرح اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں ۔ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کہیں کہیں اپنے اس ناول کے کرداروں میں خود بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کیوں کہ جس وضع

داری کے ساتھ وہ عام زندگی میں گفتگو کرتی اور ادب آداب کا خیال رکھتی ہیں۔اسی طرح ان کے اس ناول کے بیشتر کردار بھی اسی رکھ رکھا اور ادب آداب کے ساتھ حقیقی زندگی کے مسائل پر بات کرتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں،مگر کبھی شرارت کے موڈ میں،کبھی سنجیدہ انداز میں بھی سامنے آتے ہیں۔ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ لاہور میں مقیم ہیں۔

☆☆☆☆

صادقہ نواب سحر

صادقہ نواب سحرؔ (اصل نام صادقہ آراء) آٹھ اپریل 1957 کو آندھرا پردیش کے گنٹور (Guntur) میں پیدا ہوئیں۔ وہ اردو کی ایک ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں جن کے والد کا نام خواجہ میاں شیخ تھا۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر جدید اردو ادب بالخصوص نسائی فکشن اور ناول نگاری میں ایک منفرد اور معتبر نام ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی، عورت کے نفسیاتی و سماجی مسائل، اور انسانی جذبوں کو بڑی چابک دستی سے موضوع بنایا ہے۔ صادقہ نواب سحر کی ناول نگاری کی اہم خصوصیات اور ان کے معروف ناولوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اہم ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' (2008) میں چھپا۔ یہ ان کا سب سے پہلا اور مشہور ترین مونولاگ (Monologue) ناول ہے۔ یہ ناول " متاشا " نامی مرکزی کردار کی مظلومیت، سماجی کشمکش اور اس کے شعور و لاشعور کے گرد گھومتا ہے۔ "جس دن سے" بھی ان کا ایک اہم ناول ہے۔ جو سماجی رویوں اور انسانی رشتوں کے تانے بانے پر مبنی ہے۔ " مکھوٹوں کے درمیان "اس ناول میں انہوں نے انسانی منافقت اور معاشرے کے دوہرے معیاروں کو بے نقاب کیا ہے۔ ناول نگاری کے نمایاں پہلو میں نسائی شعور کی عکاسی ہے۔ صادقہ نواب سحر نے عورت کی نبض ٹٹول کر اس کے دکھ درد، تنہائی اور استحصال کو نہایت حساسیت کے ساتھ فکشن کا روپ دیا ہے۔ ان کے ناولوں میں نہ صرف نسوانی کردار جاندار ہیں۔ بلکہ انہوں نے مردانہ کرداروں (جیسے ناول میں "جیتو" کا کردار) کو بھی گہری نفسیاتی سوجھ بوجھ کے ساتھ تشکیل دیا ہے۔ وہ بیانیہ اور مونولاگ (خود کلامی) کی تکنیک کا بہترین استعمال کرتی ہیں۔ جس سے قاری کردار کے اندرونی جذبوں اور الجھنوں سے براہِ راست جڑ جاتا ہے۔ ان کے فکشن کی جڑیں ہندوستانی تہذیب اور زمینی حقائق میں پیوست ہیں،

جہاں وہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

پدرسری معاشرے میں سماجی تذکیریت کے رجحانات ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔عورت پر تشدد مردانگی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔۔صنفی امتیاز، جنسی استحصال، جنسی زیادتی، قتل وغیرہ جیسے الفاظ عمومی نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔ان میں سنسنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی دلخراش واقعہ سامنے آتا ہے۔تذکیریت کی رو سے ناول " کہانی کوئی سناؤ متاشا" کا مطالعہ کیا جائے تو مردوں کے کردار حاوی نظر آتے ہیں۔تذکیریت جیسے منفی رجحان کا عادی ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ خواتین کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہا ہے اسی کی ایک جھلک اس ناول میں نظر آ رہی ہے۔ناول نگار صادقہ نواب سحر کے اب تک تین ناول، افسانوں کے دو مجموعے، شاعری کے پانچ مجموعے، ڈراموں اور مضامین کا ایک ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ ناول ' کہانی کوئی سنا متاشا' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسے پاکستان میں بھی شائع کیا گیا اور اس کا ہندی، تیلگو اور مراٹھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

صادقہ نواب سحر نے اس ناول میں ایک عام عورت کی کہانی بیان کی ہے ناول کا بیانیہ بالکل سادہ ہے کسی قسم کی سنسنی، تحیر اور سسپنس کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔ سادہ نثر جس میں الفاظ کی کوئی پرکاری نہیں ہے۔ بین السطور کوئی کہانی نہیں ہے ایک عام مشرقی لڑکی جس کی زندگی کا آغاز صنفی امتیاز سے ہوتا ہے شعور آنے پر یہ فرق اس کے ذہن میں نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔اپنوں سے ملی نفرت متاشا کو جھوٹ بولنا سکھا دیتی ہے اپنا گھر اسے **"پھٹکار گھر "** لگتا ہے۔ پھر ایک جنسی درندے کی منہ زور حیوانی جبلت کے سامنے وہ لڑکی بے بس ہو جاتی ہے اور موریشور کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے۔اسکے بعد معاشی جدوجہد میں حصہ لیتی ہے متاشا کا اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر اپنی ماں اور دادی کے ساتھ علی گڑھ اپنے چھوٹے کاکا کے پاس جانا، زندگی کی معاشی تگ و دو میں ماں بیٹی کا نوکری کرنا، کاکا کا متاشا پر بری نظر رکھنا اس کے جنسی استحصال کرنے کا ارادہ رکھنا، علی گڑھ چھوڑ کر چھوٹے بھائی پرساد کے ساتھ ایئر ہوسٹس بننے کا خواب لیکر ممبئ چلے جانا، نوکری کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا ریلوے پلیٹ فارم پر راتیں بسر کرنا۔اِن نامساعد حالات کا مقابلہ متاشا بڑی ہمت اور حوصلے سے کرتی ہے لیکن وہ اندر سے ٹوٹتی چلی جاتی ہے وہ اپنی عمر سے دوگنی عمر کے مرد جو کہ، پانچ بچوں کا باپ گوتم ہے

اس سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے۔ جب وہ علی گڑھ واپس آتی ہے اور اپنے فیصلے سے گھر والوں کو آگاہ کرتی ہے۔ تب اس کا بھائی گوپی اِس شادی کی مخالفت کرتا ہے۔ یہاں ناول نگار نے اِس شادی کے خلاف بھائیوں کی ذہنی کشمکش کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی زندگی جوانی کے دور سے گزر کر بڑھاپے تک آ پہنچتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار متاشا نے اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ناول خود نوشت سوانح کی ہئیت میں بیانیہ وصف میں لکھا گیا ہے۔

ناول کے آغاز میں متاشا نے اپنے پر دادا کا ذکر کیا ہے جو بہت بڑے شاستری تھے۔ مندر میں پجاریوں سے بھی اونچے عہدے پر تھے اور انھیں راجا کے دربار میں بھی مقام حاصل تھی۔ ان کا لباس سونے کے تاروں اور ہیرے موتیوں سے بنا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے نے اپنی پسند سے کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہ لڑکی ہندو مذہب کے مطابق خود کو نہ ڈھال سکی بلکہ وہ تو چوکھٹ پھلانگنے سے پہلے ہی بیزار ہو گئی۔ ان کا بیٹا "درگا پرساد" شادی کر کے پہلی بار گھر آیا تو شاستری "جگد ما پرساد " نے اپنی شریک حیات کو دونوں پر گوبر اور پانی چھڑکنے کا حکم دیا۔ تا کہ بہو شد ہو جائے۔ وہ انگریز لڑکی گھبرا کر بگھی میں واپس جا بیٹھی اور ساتھ میں درگا پرساد بھی۔

اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بہو نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر گرجدار آواز سنائی دی۔ رک جا۔ پہلے ان پر گوبر پانی ڈالو پھرلا۔ ماں اس کے سر پر چہرے پر، فراک پر تیزی سے پانی چھڑکنے لگیں۔ انھیں بڑی جلدی تھی، کہیں موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے لڑکی نے جھک کر فراک پر دیکھا۔ انگلی سے چھو کر باس لی۔ ناک سکوڑی۔ چھی ای۔ ای کاؤ۔ ڈنگ۔''

اس اقتباس کا بظاہر تو متاشا سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس کے دادا پردادا کے زمانے کا واقعہ ہے لیکن بتانا مقصود یہ ہے کہ ناول نگار نے دو تہذیبوں کے ٹکرا کو کس خوبی سے پیش کیا ہے۔ بہر کیف اس شادی کے بعد جو نسل وجود میں آئی وہ نہ تو پوری طرح برہمن تھی اور نہ ہی کرسچن بلکہ ایک Mash۔ up تھی، لیکن براہمن گوتر کی پاسدار تھی۔ دوسری طرف متاشا کے نانا کے پر نانا قنوج کے برہمن تھے اور زمین دار بھی۔ اس زمانے میں

عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی جس کا اثرات پر نانا پر بھی ہوئے۔ تاشا اپنی پیدائش پر والدین کے منفی رویے کا ذکر کرتی ہے خاص طور پر والد نے کئی دن تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ ماں کے ناروا سلوک اور والد کی لاتعلقی کے درمیان پلتی متاشا کو دادی کی محبت بھری گود ملتی ہے۔ متاشا کی خوبصورتی مردوں کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے لیکن وہ مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے جس کی وجہ صفحہ پر متاشا کی عصمت دری کا واقعہ ہے وہ بھی اس کے پڑوس کے موریشور کا کا نے کیا جس میں اس کے والد کی رضامندی شامل تھی۔ خود کو مردوں سے بچاتے متاشا جوانی کے دن گزارنے لگی لیکن معاشی جدوجہد سارے کنبے کے حصے آئی اسی جدوجہد نے متاشا کو ہندوستان کے کئی شہر دکھائے جن میں بن متر پور، رڑکیلا، کولکاتہ، علی گڑھ اور ممبئی بطور خاص ہیں۔ متاشا کی زندگی میں کئی مرد آئے لیکن جس نے بھی نظر ڈالی بری نظر ڈالی متاشا نے ایک شادی شدہ مرد سے شادی کر لی جو کہ متاشا سے عمر میں سال بڑا اور پانچ بچوں کا باپ تھا۔ متاشا اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہے اور بڑے ہی سلیقے سے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتی ہیاور ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے شوہر کے انتقال کے بعد متاشا کی زندگی پھر بے سکون ہو جاتی ہے وہ سوتیلے بیٹے کے رحم و کرم پر آ جاتی ہے۔ اور اس کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ میں جتنی بار بھائیوں کے پاس بھاگ کر جاتی کتے کی طرح ذلیل ہو کر لوٹ آتی۔"

ایک بیوہ عورت کی مجبوریاں اور آزمائشیں متاشا کے کردار میں مجسم ہو کر سامنے آتی ہے وہ کہتی ہے۔

''دو سال تکلیفوں کے گذر گئے۔ انکت (سوتیلا بیٹا) کی دست درازی بھی بڑھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ اکیلا ہوتا اور میں دکھائی دیتی وہ گندی سی نظر سے مجھے سر سے پیر تک گھورتا۔ برتن لیتے دیتے وقت ایک گندا سا پچ میں ہمیشہ محسوس کرتی۔ مجھے گوتم بہت یاد آتے۔ سوتیلے بیٹے انگت کی دست درازیوں اور جسمانی تشدد سے تنگ آ کر وہ دیپو کو لے کر پہلے منالی اور پھر اڑیسہ چلی جاتی ہے۔ ایسی دربدری میں دیپو کی پرورش بھی اچھے طریقے پر نہیں ہو پاتی۔ وہ اپنی ماں پر ہو رہے ظلم و ستم کو دیکھتے ہوئے جوان ہوتا ہے۔ وہ پڑھائی چھوڑ کر کام کاج کر کے ماں کا ہاتھ تو بٹانے لگتا ہے لیکن بے راہ روی کا شکار ہو کر غلط راستے پر چل پڑتا ہے۔ نونیتا نامی لڑکی سے اسے محبت ہو جاتی

ہے۔جس کا ثمر شادی سے قبل نونیتا کے ماں بننے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دیپو نونیتا سے اسقاط
ن کروانے کا کہتا ہے لیکن دیر ہو چکی ہے۔''

ناول کا آخری حصہ سماج کی ایک نئی برائی کی طرف اشارہ کرتا ہے،جس میں سماج کے اکثر طبقے مبتلا ہو چکے ہیں اور اسے ریلیشن شپ کا نام دیا گیا ہے۔ایسے تعلقات کے نتیجے میں حمل ، اسقاط حمل ہوتے ہیں۔ناول کے اختتامیہ باب میں متا شا دیپو کے بچے کو اپنانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ایک امید کی کرن مایوسی کے اندھیرے میں جھلملانے لگتی ہے۔ناول کی کہانی ہمارے سماج کی ایک عام عورت کی کہانی ہے جس کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہوئے گزرتی ہے۔ جو کہ سماجی دبا کا شکار ہوتی ہے ناول نگار نے حساس موضوعات کا احاطہ سادگی اور خوبصورتی سے کیا ہے۔

☆☆☆☆

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین 18 اگست 1913 کو پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا اصل نام مصداق فاطمہ تھا اور ادبی نام صالحہ عابدہ حسین تھا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ غلام الثقلین تھا اور والدہ کا نام مشتاق فاطمہ تھا۔ آپ کی والدہ مشتاق فاطمہ الطاف حسین حالی کی نواسی تھی۔ آپ کے والد عصر جدید نامی رسالے کے مدیر تھے۔ قوم کو آپ کے والد سے بڑی امیدیں تھیں لیکن وہ صرف 42 برس کی عمر میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد آپ کے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان چلے گئے۔ آپ کی والدہ بہت اچھا ادبی ذوق رکھتی تھی۔ آپ کی پہلی کہانی تیری چودہ برس کی عمر میں چھپی۔ 17 اپریل 1933 کو 20 برس کی عمر میں ان کی شادی ڈاکٹر سید عابد حسین سے ہوگئی۔

صالحہ عابد حسین بڑی دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ آپ بہت باہمت خاتون تھیں بڑے بڑے حادثوں میں بھی آپ ثابت قدم رہیں۔ آپ نے ناول نگاری سے شہرت حاصل کی۔ صالحہ عابد حسین کے کرداروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو صرف نہ وہ صرف خوبیوں کا مجسمہ ہوتے ہیں کہ فرشتہ لگے اور نہ ہی اتنے برے ہوتے ہیں کہ شیطان بن جائیں بلکہ وہ عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں خامیاں بھی ہوتی ہیں، ان کے ناولوں میں بعض جذبات کی فراوانی ہے اور ان کی ترجمانی حقیقت پسندانہ ہے ان کے کردار حب الوطنی مامتا زن وشوہر کی محبت اثار وقربانی جیسے پاکیزہ جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ درحقیقت صالحہ عابد حسین نے اپنے ناول اور کہانیوں کا مواد براہ راست اپنے عہد کی زندگی سے لیا ہے۔ اس لیے ان کے فن میں حقیقت اور سچائی کی جھلکیاں ملتی ہیں ان کے کرداروں میں زندگی کے پہلو اور حقیقت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ یہ ناول نگار کی صناعی اور فنی قدرت کا ثبوت ہے۔

اسرا ان کا پہلا ناول ہے جو 1940 میں چھپا عذرا ناول میں ناول کی ہیروئن کا نام عذرا ہے۔وہ ایک معمولی لڑکی ہے۔دوسرے ناول نگاروں کی طرح ان کی ہیروئن نہ تو دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے،اور نہ محلوں میں رہنے والی امیرزادی ہے۔نہ ہی اسے کسی شہزادے کا انتظار ہے۔نہ وہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔مرد حضرات کا کردار بڑا جیتا جاگتا کردار ہے۔عذرا ایک ایسے گھرانے میں پلی بڑھی۔جو تو بالکل قدامت پرست تھا اور نہ ہی لکیر کا فقیر اور نہ ہی جدیدیت کا نمونہ۔اسے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ناول سے ایک اقتباس:

عذرا اداس ہو کر۔''نہ جانے امیروں کے دل کیسے ہوتے ہیں؟ میرے پاس روپیہ ہوتا تو سب کا سب شوقین لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیتی۔''

انصار مسکرا کر''جب ہوگا تو اپنے اس نیک ارادے کو بھول نہ جانا۔''

عذرا منہ بنا کر'' میرے پاس کبھی روپے نہیں ہوگا۔ مجھے روپے جمع کرنے کا شوق نہیں۔ ہاں کبھی کبھی کسی غریب کو دینے یا اسکول کے لیے یا تعلیم پانے کے لیے جی چاہتا ہے کہ بہت سارا روپیہ ہو۔''

''آتش خاموش'' صالحہ عابد حسین کا دوسرا ناول ہے یہ 1947 کے اوائل میں لکھا گیا لیکن تقسیم ہندوستان کے فسادات میں یہ چھپ نہ سکا یہ 1953 میں چھپا۔اس میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو شریف خاندان کی ہے۔اس کا گھرانہ پرانی قدروں کا حامی ہے اور نئی تہذیب کی خوبیوں کا دلدادہ بھی ہے۔وہ ایک روشن خیال باپ کی بیٹی ہے۔اس کے والد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسے انگلینڈ بھیج دیتے ہیں وہیں اس کی ملاقات ڈاکٹر جاوید سے ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر جاوید کے بلند کردار اور شخصیت سے متاثر ہو جاتی ہے اور ان کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اس سے بے انتہا محبت کرتے ہوئے بھی شادی نہیں کرتے کیونکہ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ ہیں۔جب انجم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر جاوید شادی شدہ ہے تو اسے بہت صدمہ ہوتا ہے انجم کا کردار مثالی ہے۔دنیا میں ایسے کرداروں کی بربار ہے وہ خوش مزاج اور خوش گفتار ہے ڈاکٹر جاوید بھی انجم سے خاموش محبت کرتے ہیں لیکن دونوں کے پیروں میں سماج کی بیڑیاں ہیں۔اس ناول

کے کرداروں میں ڈاکٹر جاوید، انجم، ڈاکٹر یوسف، نادرہ، عباس صاحب، نانی اماں حسینہ بیگم، شیخ جی وغیرہ ہیں۔

"**قطرے سے گوہر ہونے تک**" صالحہ عابد حسین کا تیسرا ناول ہے۔اقبال، حسن، مانی،، سیما، ناظرہ، اختر اور عابد علی کے کرداروں نے ناول میں جان پھونکی ہے۔صالحہ عابد حسین نے قطرے سے گہر ہونے تک میں انیس کی زندگی کے مدو جزر کا بیان کیا ہے۔انیس کے کردار میں ایسی دل کشی اور حسن ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے رک کراس پہ غور کرنے لگتے ہیں۔انیس کا کردار بڑا جیتا جاگتا اور دلکش کردار ہے اس ناول کی خامیوں میں یہ ہے کہ انہوں نے کچھ کرداروں کو بڑا جامع دکھایا جیسے سلمان کا کردار انہیں اپنے کچھ کرداروں سے ایسی محبت ہے کہ انہیں ان میں بشری کمزوریاں یا فطری خامیاں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

''**راہ عمل**'' صالح عابد حسین کا چوتھا ناول ہے اس میں نئے ہندوستان کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ ناول میں ہندوستان کے گاں کملانگر کا ذکر ہے۔حبیب میاں، صفیہ بیگم، گیتا، انوپم، ندیم وغیرہ ایسے کردار ہیں جو کہ اس چھوٹے سے گاں میں بیداری کی لہر دوڑاتے ہیں۔ناول کا کینوس کافی وسیع ہے۔

ناول سے ایک اقتباس:

'' اگر محبوب کی خامی اور کمزوریوں کو جاننے کے بعد اس کی برائیوں کو سمجھنے پر بھی محبت باقی رہے اس کی محرومیوں کے باوجود اس سے پیار باقی رہے۔ اگر زمان اور مکاں کی دوری بھی اس محبت کی شدت میں کمی نہ کر سکے تب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ محبت سچی اور پائیدار ہے۔محبت کی ایک بہت بڑی پرکھا یہ ہے گیتا کہ انسان اس پر کبھی پچھتاتا نہیں کبھی اس کے ضمیر یا دل میں کھٹک نہیں ہوتی۔ساری دنیا کی مخالفت اور ملامت پر بھی وہ پشیمان نہیں ہوتا۔دکھ اور کٹھنائیاں اسے مغلوب نہیں کر پاتی اسے اپنے اوپر بھروسہ محبوب سے پریم زندگی سے پیار ہر حال میں باقی رہتا ہے یہ ملاپ صرف جسموں کا نہیں صرف دلوں کا نہیں دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔''

صالحہ بیگم کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ مکالموں کی برجستگی اور طرز ادا کی خوبی نے ان کو واعظ اور ناصح ہونے سے بچالیا۔ان کے ناول ''**یادوں کے چراغ**'' کا پلاٹ بہت مربوط اور منظّم ہے۔

پوری 40 سالہ زندگی کو مصنفہ نے چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔انہوں نے کول کے اردگرد ایک قدرتی ماحول کو چنا ہے۔ یادوں کے چراغ کرداروں کا نگار خانہ ہے۔ انہوں نے ناول کے واقعات کو عورت کے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔اس طرح یہ ناول تانیثی رنگ لیے ہوئے ہے۔ناول میں غم انگیزی اور دردناک لہجہ شروع سے آخر تک ہے۔''اپنی اپنی صلیب'' نامی ناول میں صالحہ عابد حسین نے اس بات کی تشریح کی ہے کہ سادگی میں بھی عمدگی ہوتی ہے ناول کا پلاٹ سادہ ہے۔ اوسط درجے کے مسلم جاگیردار خاندان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔کہانی کے خاص کردار چار ہیں۔ علی،اصغر،زہرا،رضوانہ۔

علی اصغر زوال پذیر جاگیردانہ نظام کی خامیوں اور خوبیوں کا صحیح نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔ زارا کے کردار میں زندگی اور ولولہ ہے۔

''الٹی ڈور'' ایک ایسا ناول ہے جس میں زبان و بیان کا لوچ موجود ہے۔الٹی ڈور کے خاص کردار آسیہ ،احسن، گڈی بی بی بیگم، ہجومیاں، سعدی، رازی، ستارہ، پنو، کنیھا جی ہیں۔ ہر کردار اپنی جگہ پر موضوع ہے ناول کے انتساب میں لکھا ہے۔

> '' ہندی عورت کے اس روپ کے نام جو مرمر کر جیتی اور جی جی کر مرتی ہے مگر ہار نہیں مانتی۔''

صالحہ عابد حسین کا تعلق مولانا الطاف حسین علی کے خانوادے سے تھا۔لیکن انہوں نے اپنی پہچان اپنی محنت سے خود بنائی۔انہیں پدم شری اعزاز سے بھی نوازا گیا۔صالحہ عابد حسین 18 جنوری 1988 کو دلی بھارت وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

صغری مہدی

صغری مہدی کی پیدائش بھوپال میں ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو سے بھی منسلک بھی رہیں۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ء میں کیا۔انہوں نے پانچ ناول ''پابہ جولا،دھند ،پروائی،راگ بھوپالیاور جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو۔'' لکھے۔

صالحہ عابد حسین صغری مہدی کی ممانی اور ڈاکٹر سید عابد حسین ان کے سگے ماموں تھے۔ان کا بچپن مدھیہ پردیش کے قصبہ باڑی جو کہ بھوپال سے 60 میل دور ہے میں گزرا۔ جہاں وہ اپنے والد سید علی مہدی اور ماں سعادت فاطمہ کے ساتھ رہتی تھی ان کے والد پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔

''جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' صغری مہدی کا ناول ہے جس میں انسانی رشتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی میں دلچسپی بھی ہے۔سادگی بھی ہے رشتوں کی گتھیوں کو سلجھانا مشکل ہوتا ہے۔صغری مہدی کے ناول کی یہ کہانی سیدھے سادے انداز میں بیان کی گئی ہے۔انسانی رشتوں کی بساط پر اس ناول کے کرداروں کی زندگی کافی پر پیچ ہے۔کہانی معنی خیز بھی ہے اور اپنے بیان کی سادگی اور بہا کی وجہ سے دلچسپ بھی ہے۔

''پابہ جولاں'' ناول سے اقتباس:

''پورا ایک ہفتہ اسے کانٹوں کی سیج پر لوٹتے گزر گیا۔یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسا کٹھن مقام ،ایسی فیصلہ کن گھڑی بھی آئے گی۔کافی کشما کش سے وہ کیسے نجات پائے۔ وہ بے وجہ ہی گلاب کی کیاریوں کو کھرپے سے کرید رہی تھی مگر اسے فیصلہ کرنا چاہیے۔ نہیں نہیں۔یہ نہیں ہو پائے گا۔تم نے ایسا سوچا ہی کیوں۔ میں نے تمہیں چاہا تھا۔ضرور۔ہاں شعوری طور پر چاہا تھا۔مگر اس طرح جس طرح مدھو تمہیں چاہتی ہے۔مگر اب۔ اف کیا کروں۔ کس سے اپنے دل کا حال کہوں۔کس سے مشورہ مانگوں۔کوئی نہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں اور پھر یہ

تو مجھے ہی کرنا ہے کوئی اور بتا دے گا بھی کیا۔ مگر مجھے ہو کیا گیا ہے۔ میں تو اپنے کو بڑا صاف گو۔ بڑا مضبوط سمجھتی تھی۔ جو دم بھر میں ہر فیصلہ کر ڈالتی تھی۔''

ناول ''پاں بہ جولاں'' کی کہانی عام انسان اور عام افراد کی کہانی ہے۔ جو کہ رومانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔اس ناول میں تانیثی رنگ بھی نمایاں ہے۔ جو کہ صغری مہدی صاحب کے اسلوب کا ایک اہم پہلو ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، رواں اور شستہ ہے۔دبستان دلی کی اور دبستان لکھنو کی امتزاجی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔

ناول سے ایک اقتباس:

''سنا ہے کہ پتھر پر بھی پانی ڈالتے رہو تو گڑھا پڑ جاتا ہے۔تم کس قسم کے پتھر ہو، اب تو ان مفروضوں سے بالکل اعتماد اٹھ گیا ہے۔دل میں ایک بھاری خلا کا احساس ہے، کیوں ہے، مجھ سے محبت کرنے والوں کی کمی تو نہیں ہے، میری زندگی میں کتنے مرد آئے جنہوں نے مجھے چاہا ،میری ایک ایک ادا کو ایڈ مائر، کیا میری تنہائی کو مٹایا۔ مجھے یہ بات کہتی نے سمجھائی تھی کہ محبت ایک سمت بہنے والا دریا نہیں ہے وہ تو مختلف سمتوں میں بہتا ہے اور اسے بہنا چاہیے اس نے کھلے لفظوں میں میری دلکشی خوبصورتی اور بقول اس کے سیکس اپیل کی تعریف کی وفا اور ایک کے ہو رہنے کے دقیانوسی مفروضے کا جی کھول کر مذاق اڑایا اس نے مڈل کلاس کے مورل کو خوب برا بھلا کہا تم جیسی حسین ذہین عورت اور یہ بیوقوفی کی باتیں۔تم نے تو سماج کے بہت سے فرسودہ بندھن توڑ دیے ہیں ان سے خود کو مکتی دو"

صغرا مہدی صاحبہ نے کافی کتابیں لکھی وہ عمر بھر تدریس کے شعبے سے وابستہ رہیں وہ دلی انڈیا میں 2014 میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

صغرا ہمایوں مرزا

صغرا ہمایوں مرزا حیدر آباد کے معزز خاندان میں 1884ء میں پیدا ہوئیں۔ والد محترم ڈاکٹر حاجی صفدر علی مرزا اپنی شرافت اعلی قابلیت اور وضع داری کے لیے مشہور تھے۔ 1901ء صغری ہمائیوں مرزا کی شادی بیرسٹر سید ہمایوں مرزا سے ہوئی۔ صغراں ہمایوں مرزا نے 1917 میں ایک انجمن قائم کی۔ جو سوشل ورک کرتی تھی۔ آپ کی تصنیفات مندرجہ زیل ہیں۔ **''مشیر نسواں، تحریر النسا، سفینہ نجات، مجموعہ نصائح، سرگزشت ہاجرہ ،موہنی مقالات صغری، آواز غیب، سفر نامہ عراق، سفر نامہ پونا، سفر نامہ یورپ، سیر بہار و بنگال، سیاحت جنوبی ہند، رہبر کشمیر۔''** ان کا پہلا ناول ''مشیر نسواں'' ہے یہ ناول ان نادر الوجود کتابوں میں سے ہے جن سے خواتین کی تصنیف و تالیف کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی کتاب مشیر نسواں پر طویل رائے لکھی ہے اور اسے خواتین کے لیے مفید ترین قرار دیا آپ فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان کے شریف اور ذی لیاقت خواتین میں سے ایک سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ جنہوں نے مشیر نسواں لکھ کر اپنے ہم جنس طبقے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کتاب ناول کے پیرائے میں لکھی گئی ہے اور کافی نصیحت آمیز ہے۔ لائق مصنفہ مشیر نسواں میں وہ نتائج اولاد کی بے تربیت ہونے سے پیدا ہوئے ہیں جیسے لڑکوں کا بے ادب بدتمیز اور نافرمان ہونا لڑکیوں کی کاہلی سستی اور ضد ہٹ دھرمی وغیرہ کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے اور جو خرابیاں ظہور میں آتی ہیں ان کو نہایت موثر طریقے سے دلنشی کیا ہے وقت کی قدر کفایت شعاری سلیقہ سلیقہ مندی اور سادہ زندگی کی تعریف اور بے سلیقگی فضول خرچی بیہودہ رسوموں پر یقین اور بازاری عورتوں کی بات پر یقین بے سوچے سمجھے دوسروں کی تقلید شوہر کے آرام کا خیال نہ کرنا وغیرہ

وغیرہ خصلتوں کے موزے نتیجوں کا اچھے انداز میں بیان کیا ہے یہ ناول فرقہ نسواں کے لیے نئ معلومات فراہم کرتا ہے۔''

ان کا ناول میں درویش اور مونی کے درمیان مکالموں کے ذریعے سے نصیحتیں کی گئی ہیں اس ناول کے اندر انہوں نے کھانے پکانے کی طرح کی کو بھی شامل کیا ہے کہیں پلاؤ بنانے کی ترکیب لکھی ہے تو کہیں انہوں نے انہوں نے کوئی اور ترکیب لکھی ہے انہوں نے درویش اور مونی کے درمیان گفتگو میں جہانگیر اور نور جہاں کا قصہ بھی بیان کیا ہے نور جہاں کا قصہ انہوں نے توصیفی انداز میں بیان کیا ہے۔موہنی سے اقتباس:

'' دنیا میں ہم ایک ہی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ایک ہی طرح سے جاتے ہیں فقیر کا بچہ بھی ننگا پیدا ہوتا ہے اور بادشاہ کا بھی ننگا پیدا ہوتا ہے اگر بادشاہ کا بچہ موتی ہیرا پہن کر پیدا ہوتا اور فقیر کا بچہ ننگا پیدا ہوتا تو البتہ فرق کرنا چاہیے تھا۔ایک شخص جو ہمیشہ دنیا میں نیکی کرتا ہے کسی قسم کی برائی نہیں کرتا لیکن ہمیشہ وہ تکلیف میں رہتا ہے ایک دوسرا شخص بھی ہمیشہ نیک کام کرتا ہے لیکن اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی ہمیشہ خوش و بامراد رہتا ہے۔''

درویش:''اس جھگڑے میں آپ کیوں جاتی ہیں اس میں خاموشی بھلی ہے۔''

صغرا ہمایوں مرزا کا ناول'' موہنی'' 1929 میں چھپا۔ادبی خدمات: وہ اردو کی ابتدائی خاتون ناول نگاروں میں شمار ہوتی ہیں اور انہوں نے لگ بھگ 14 ناول لکھے۔ان کی مشہور کتابوں میں ''موہنی'' اور ''مشیرِ نسواں'' شامل ہیں۔معروف اردو ادیبہ، شاعرہ اور سماجی کارکن بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا انتقال 1958 (بعض ذرائع کے مطابق 1959) میں حیدرآباد، انڈیا میں ہوا۔انہیں حیدرآباد دکن میں ان کے قائم کردہ صفدریہ گرلز اسکول کے احاطے میں دفن کیا۔انہوں نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد ان کا عالیشان مزار بنوایا تھا جس میں بعداز وفات خود بھی دفن ہوگئی۔اس مزار کا انتظام ایک ٹرسٹ چلاتا ہے۔صغراں ہمایوں مرزا بے اولاد تھیں۔

☆☆☆☆

طاہرہ اقبال

طاہرہ اقبال فیصل آباد میں مقیم ہیں۔وہ گورنمنٹ کالج مدینہ ٹاؤن یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کی ہیڈ تھی وہ مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں ان کے ناولوں میں نیلی بار، گراں مشہور ہوئے۔طاہرہ اقبال پاکستانی ناول نگار، افسانہ نگار، سفر نامہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔

ان کا ناول ''نیلی بار'' ناول دس ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں ہر باب پچاس کی دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی پر پھیلی سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور شعوری ارتقا کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تانیثی اور مزاحمتی رنگ لیا ہوا یہ ناول عورت کی مجبوری کی داستان بھی بیان کرتا ہے اور یہ مقامی لوگوں پر بااثر افراد کے تسلط کو بھی بتاتا ہے کہ کس طرح دبے ہوئے کمزور، ان پڑھ لوگوں کو ظلم کی چکی میں پسا جاتا ہے اوران پر حکمرانی کی جاتی ہے۔

ہمارے پسماندہ دیہاتوں کا آج بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ عورت کو ایک جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے عورت ان کے نزدیک ایک بچہ پیدا کرنے والی مشین ہے۔جس کو قدرت نے دنیا میں بچے پیدا کر کے پالنے کے لیے بھیجا ہے اور وہ ایک خادمہ ہے۔جس کی فرائض میں سسرال والوں کی خدمت، دیکھ بھال شوہر کی خدمت اور اطاعت اور سارے گھر کے لیے وہ ایک قربانی کا جانور ہے۔

اس ظلم کے نظام کو تقویت دینے والی خود خواتین ہیں گھر میں رہنے والی خواتین ہی بہو پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتی ہیں افسوس کہ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا۔عورت مرد کے لیے ایک کھلونا ہے چاہے وہ مرد امیر ہو یا غریب خواندہ ہو یا ناخواندہ ہو اسی حقیقت کو طاہرہ اقبال نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے کہ ایک غریب عورت مرد کے لیے ایک جنس کے حصول کا آسان ہدف ہے، جبکہ دوسری طرف

امیر خواتین جنسی نا آسودگی کا شکار ہیں۔مگر سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ خواتین امیر ہیں یاغریب دونوں ہی مجبور ہیں ہمارے اس سماج میں پتہ نہیں کب خواتین کوان کے بنیادی حقوق ملیں گے اس پدرسری معاشرے میں عورت کوکب مقام ملے گا سوال یہ ہے کہ فطرت نے عورت کومرد کے لیے کھلونا بنا کے کیوں پیدا کیا ہے۔حوا کوآدم کے لیے کیوں بنایا گیا ہے؟ کیوں؟

ناول نگار نے ناول میں جوڈکشن استعمال کیا ہوتا ہے دیہاتی ہے ناول میں بار بار دیہاتی پس منظر دکھایا گیا ہے اور پنجابی کے بہت سارے الفاظ جو ہیں اس ناول میں شامل ہیں اس ناول میں جو مقامی ذات ہیں ان کے رسم رواج ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اوران ذاتوں کے رہنے والے افراد کس قسم کے عادات کے مالک ہوتے ہیں اس کو بھی بتایا گیا ہے نیلی بار کا علاقہ کس تہذیب ثقافت اور تمدن کا نمائندہ ہے اس پر بھی ناول نگار نے تاریخ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

شروع میں تو کہانی بہت تیزی سے چلتی ہے اس میں اتار چڑھا ہے قاری کی دلچسپی اس کے اندر برقرار رہتی ہے لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے خاص طور پر کہانی کے نویں اور دسویں باب میں قاری کے دلچسپی بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔لگتا ہے ناول نگار نے آخری دو باب خاصی عجلت میں لکھے ہیں۔کہانی پر گرفت آخر تک پہنچتے اس قدر ڈھیلی محسوس ہوتی ہے کہ بس کہانی ختم کرنے کی ہی دلچسپی باقی بچتی ہے۔شاید اگر یہی کہانی محدود کینوس کے ساتھ لکھی جاتی تو یہ اردو کی چند مضبوط اور طاقتور کہانیوں کے طور پر ابھر کر سامنے آتی۔کینوس کی وسعت پر آگ کا دریا اردو ادب کا ایک نمائندہ ناول ہے۔

جس میں کینوس کی وسعت کے باوجود اسلوب کی انفرادیت ،منظر نگاری تجسیم نگاری، کردار نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری خود کو آخر تک کرداروں کے ساتھ ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ناول کے مرکزی کرداروں میں زارا اور پاکیزہ نامی دو خواتین ہیں جو کہ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں مگر الگ الگ زندگیاں گزارتی ہیں۔کہانی کے کرداروں میں عبدالرحمٰن ،علی جواد،

اسرار احمد وغیرہ ہیں۔ سستی جذباتیت ،جنسی بھوک ، ہوس ، کرداروں کی بے جوڑ شادیاں ناول کے منفی پوائنٹس ہیں۔ ان کے مقابل پاکیزہ کا کردار ہے جو کہ ایک دیہی عورت کے نمائندگی کرتا ہے۔ ایسی عورت جس کا کردار ایک مضبوط عورت ہے وہ اپنی نسوانیت کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اور ایک مثالی عورت بن کر ابھرتی ہے۔

ناول کا ڈکشن طاہرہ اقبال کا اپنا خود ساختہ ہے۔ ناول میں پنجابی کے ماہیے، دوہڑے اور ٹپوں کا برمحل اور خوبصورت طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی 21 اگست 1915 کو بدایوں اتر پردیش میں پیدا ہوئی۔ جودھپور اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی ان کے بھائی عظیم چغتائی بھی لکھاری تھے۔ عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں تانیثیت کی بھرپور عکاسی کی ہے اور جس طرح انھوں نے عورتوں کی تصویر کشی کی وہ کسی اور خاتون تخلیق کار کو نصیب نہ ہو سکی۔ انھوں نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کو خصوصا اپنے ناولوں کا حصہ بنایا، اوران کے جذباتی اور جنسی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

عورت کے احساسات وجذبات، سماج میں اس کی حیثیت، اس کی نفسیات وغیرہ کو بہت خوبصورتی سے پہلی بار کوئی خاتون الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر منظر عام پر لے کر آئی۔ ان کے ناولوں میں ''ٹیڑھی لکیر'' اور'' دل کی دنیا'' تانیثی اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے تمام معاشرتی برائیوں، اہر مقام اور منزل سے عورت کی برابری کی حمایت کرتی ہیں۔ عصمت کے فکشن پر بہت زیادہ اعتراضات کیے جاتے تھے ان کے فنکشن میں موجود نوجوان لڑکے لڑکیوں میں پائی جانے والی جنسی گھٹن کو نشانہ بنایا جاتا تھا ان کے افسانے اور ناول نفسیاتی رنگ لیے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے حصے میں بہت بدنامی آئی۔

جس وقت انہوں نے فکشن کا اغاز کیا اس وقت کا برصغیر شدید سماجی سیاسی اور مذہب گھٹن کا شکار ایک ملک تھا۔ جس پر فرنگی حکمران تھے فضا میں بھی گھٹن تھی اور خود انسانوں کے اندر بھی گھٹن تھی اسے گھٹن کو عصمت نے محسوس کیا۔ عصمت کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ان کے فنکارانہ خلوص کا آئینہ دار ہے۔ یہ اپنے طنزیہ اسلوب کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں عصمت نے صرف مشاہدات ہی نہیں پیش کیے ہیں بلکہ اس سچائی کو بھی

ظاہر کیا ہے کہ کس طرح ماحول سے فرد کی زندگی میں آہستہ آہستہ انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس انقلاب کے نتیجے میں کس طرح شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔اس ناول میں انھوں نے مسلم متوسط خاندانوں کی پردہ نشیں لڑکیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے رونما ہونے والے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ان خاندانوں میں کون کون سی معاشرتی برائیاں عام ہیں انھیں واضح اور طنزیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصد ان خاندانوں کی تذلیل و تضحیک نہیں ہے بلکہ اصلاح و درستی اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔اس کے پیش لفظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ٹیڑھی لکیر دراصل عصمت کی آپ بیتی ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ٹیڑھی لکیر'' دراصل عصمت کی آپ بیتی ہے۔ مجھے خود یہ آپ بیتی لگتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ میں نے سخن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔اس کی کمزوریوں سے جل بھی اٹھی ہوں۔اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔اس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخارے بھی لیے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں۔

ناقدین نے ''ٹیڑھی لکیر'' کو اردو ادب کا ایک شاہکار ناول قرار دیا ہے۔اس کی ہیروئن سمن اردو کے قدیم ناولوں کی ہیروئنوں سے قطعی مختلف ہے۔وہ جدید دور کی عورت ہے جس کے پیش نظر جدید مسائل ہیں۔

عصمت کے دیگر اہم ناولوں میں ''**معصومہ**، سودائی، **عجیب آدمی**، **دل کی دنیا** اور **ایک قطرہ خون**'' بھی شامل ہے۔''**معصومہ**'' بمبئ کے ماحول پر لکھا گیا ہے۔اس میں فلمی دنیا اور سرمائے داروں کی سچی تصویر کھینچی گئی ہے۔''سودائی'' کا شمار کمرشل ناولوں میں ہوتا ہے۔ یہ ناول وجود میں آنے سے پہلے ''**بزدل**'' کے عنوان سے پردے پر فلمایا جا چکا تھا۔بعد کو اسے ناول کا لباس دیا گیا۔''**عجیب آدمی**'' بھی فلمی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔''**دل کی دنیا**'' ایک سماجی ناول ہے۔اس میں خاندان اور معاشرے کے قدیم رسم و رواج میں جکڑی ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو شوہر کی بے التفاتی کا شکار ہو جاتی ہے۔

عصمت نے **ایک قطرہ خون** اپنے مخصوص انداز، مزاج اور لب و لہجے سے ذرا ہٹ کر لکھا ہے۔اس کا

موضوع واقعہ کربلا ہے جو تاریخ اسلام کا ایک نمایاں باب ہے۔اس کتاب پر ڈاکٹر ظ انصاری نے کتاب شناسی میں تفصیل سے تبصرہ کیا ہے اوراس میں موجود تاریخی غلطیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا ہے۔ان کی ذات ان کی ذات کی سب سے بڑی خامی ان کی بغاوت تھی لیکن یہی بغاوت ان کو لکھنے پر بھی مجبور کرتی تھی۔اس طرح یہ خامی ان کی خوبی بن جاتی تھی انہیں اپنے اردگرد کے ماحول سے نفرت تھی خاص طور پر ان کو لڑکیوں کی برصغیر کے معاشرے میں دبی ہوئی حیثیت سے نفرت تھی ۔لڑکی لڑکے کے برابر کیوں نہیں ہیں عورت مرد کے برابر کیوں نہیں ہے یہ سوالات بچپن سے ان کے ذہن میں کل بلاتے تھے اور جب اپنا موازنہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کرتی تو انہیں یہ سوچ کر بہت غصہ آتا ایک گھر کے کاموں کی ذمہ داری لڑکیوں پر کیوں ڈالی جاتی ہے اور لڑکوں کو آزاد کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اسی لیے انہیں بچپن سے ہی گھر کے خصوصا کچن کے کاموں سے بڑی نفرت تھی اور وہ اپنے بھائیوں کا مقابلہ کیا کرتی تھی جو جو کام ان کے بھائی کیا کرتے تھے۔وہ ابھی وہی کام کیا کرتی تھیں یہی وجہ تھی کہ ساری عمر ان کی اپنے بھائیوں سے نہیں بنی۔ان کے مزاج کا جو حصہ بغاوت تھا ان میں کہیں شاید ان کے خون کا بھی اثر تھا۔جو بات کیا کرتی تھی ۔بے لاگ کیا کرتی تھیں۔نڈر اور بے خوف خاتون تھیں۔کہیں بھی کسی مقام پر بھی نہ کبھی جھجکی۔نہ کبھی ڈری۔انہوں نے با آواز بلند کہا۔جو بھی کہا۔جیسی وہ باہر سے تھیں۔ ایسی ہی وہ اندر سے تھی۔ان میں منافقت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سماج کو ان کی تحریر نا قابل قبول ہوگئی۔

عصمت چغتائی چوبیس اکتوبر 1991ء کو بمبئی میں انتقال کر گئی۔

☆☆☆☆

عفت موہانی

عفت موہانی کا اصل نام خورشید سلطانہ ہے۔ پچیس جولائی ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے، ایم۔ اے، اور بی۔ ایڈ کیا۔ عفت موہانی مشہور شاعر اور صحافی حسرت موہانی کی رشتہ دار ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح عفت موہانی کا مزاج بھی سادگی لیے ہوئے ہیں۔ وہ دیندار سوچ رکھتی ہیں اور یہی سوچ ان کے ناولوں اور افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

عفت موہانی کی ڈکشن میں پدرسری معاشرے کی سوچ نمایاں نظر آتی ہے۔ جن خواتین کو وہ اپنے ناولوں میں، افسانوں میں کردار بنا کر پیش کرتی ہیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جن کے پاؤں میں ان دیکھی کی بیڑیاں ہیں۔ یہ سماج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ رشتوں کی مجبوریاں ان کے قدموں میں حائل ہیں۔ اور یہ چاہتے ہوئے بھی اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزار نہیں سکتی۔ انہیں اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ عورت قربانی کا دوسرا نام ہے۔ یہ سوچ یہ، نظریہ عفت موہانی صاحبہ کی تحریروں میں بہت شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اردو کی مشہور ناول نگار عفت موہانی نے 1971 سے 1995 کے درمیان تقریبا 85 سے زائد ناول تحریر کیے۔ ان کے مجموعی ناولوں کی تعداد 100 کے قریب بتائی جاتی ہے، جن میں ''ستم کے سہارے، درد و درماں، اور قافلے بہار'' کے نمایاں ہیں۔ انہوں نے معاشرتی، اخلاقی، اور نفسیاتی موضوعات پر لکھا۔ ان کی تحریروں میں اخلاقی، اصلاحی، تانیثی، مزاحمتی اور معاصر رنگ نمایاں ہے۔

عفت موہانی کا سب سے پہلا ناول ''ستم کے سہارے'' ہے۔ جو ۱۹۷۱ء میں نسیم بک ڈپو لکھنو سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول عفت موہانی نے نسیم انہونوی (ناول نویس) کی فرمائش پر لکھا۔ جوان کے ماہنامہ''

حریم‘‘ میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ یہ ناول ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول میں تین کردار اہم ہیں خالد، روبینہ اور ناہید۔ یہ تینوں کردار ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔محبت کرتے ہوئے اپنے آپ پر ستم کرتے ہیں۔

خالد اور روبینہ دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔خالد روبینہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔خالد اپنے والد کرنل صاحب سے شادی کی بات کرتا ہے۔کرنل صاحب کو یہ رشتہ پسند نہیں۔ وہ خالد کا رشتہ ناہید سے طے کرتے ہیں۔خالد کو اپنے ماں باپ سے اپنی بات منوانے کی ہمت نہیں اور خالد روبینہ کو لئے کر گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔روبینہ ایک مشرقی شرم وحیا والی لڑکی ہے۔خالد کے ساتھ بھاگنے سے انکار کر دیتی ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ مجھے تم سے کبھی محبت ہی نہیں تھی۔خالد گھر آ کر اپنے گھر والوں کی مرضی کے آگے جھک جاتا ہے۔ناہید سے شادی کر لیتا لیکن روبینہ کی محبت کو دل سے نہیں بھلا پاتا۔شادی کی رات روبینہ بیمار ہو جاتی ہے۔خالد روبینہ کی عیادت کے لئے جاتا ہے۔خالد کو جب پتہ چلتا کہ روبینہ آج بھی اسے بے حد چاہتی ہے۔خالد بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ناہید خالد کی تیمارداری میں اپنے آپ کو وقف کر دیتی ہے جبکہ خالد ناہید پر ظلم کرتا اسے طلاق دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ناہید اس امید کے سہارے رہتی کہ ایک نہ ایک دن خالد اسے اپنا لے گا۔ناہید اپنی محبت خالد پر نچھاور کر دیتی ہے ہر چھوٹی بڑی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔خالد ناہید کی معصومیت کی وجہ سے ناہید کو چاہنے لگتا ہے۔لیکن ناہید کو اس بات کا انکشاف ہو جاتا کہ خالد روبینہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ناہید خالد سے کہتی کہ اگر پہلے ہی بتا دیتے روبینہ سے محبت ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی اور یہ بھی کہتی کہ وہ روبینہ سے شادی کر لے دونوں کی خدمت کر کے وہ اپنی زندگی گزار لے گی۔خالد ناہید پر ظلم کر کے دراصل اپنے ماں باپ سے بدلا لے رہا تھا۔مگر اس کی سزا ناہید کو مل رہی تھی۔ناہید خالد سے کہتی ہے کہ:

> ’’آپ اسے بھول نہیں سکتے اپنی محبت پر جھوٹی آن اور بناوٹی نفرت کا پردہ نہ ڈالئے۔آپ خود کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں، روبینہ کو بھی اور مجھے بھی آپ میں اتنی ہمت نہ تھی۔ آپ اپنے کو بھی بچا لیتے روبینہ کو بھی اور مجھے بھی۔کیا ملا آپ کو اور کیا پایا آپ نے۔‘‘(ناول ستم کے سہارے

از۔عفت موہانی ص۴۰،۱۹۷۱ نسیم بک ڈپولکھنو۔)

ناہید سوچنے لگتی ہے کہ روبینہ خالد کی محبوبہ ہو کر خالد کے لئے مرمٹ سکتی ہے میں تو بیوی ہوں۔ کیوں نہ ان کے راستے سے ہٹ کر ہمیشہ کے لئے دونوں کو ملوا دوں یہ سوچ کر خودکشی کر کے اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔ناہید مرتے مرتے بھی اپنی موت کو اتفاقی حادثہ قرار دے کر روبینہ اور خالد کو تمام الزامات سے بری الذمہ کر جاتی ہے۔

خالد کے والدین کی خوشی کے لئے روبینہ بھی ایک معذور شخص سے شادی کر کے زندگی گزار رہی تھی۔ ناہید کی قربانی سے پھر دو بچھڑے محبوب مل جاتے ہیں۔نسوانی کردار میں ناہید اور روبینہ کے کردار بہت خوب ہیں۔خالد کا کردار ایسا ہے جو باپ کی خوشی کی خاطر تمام آرزوں کا گلا گھونٹ دیتا اور ویران زندگی گزارنے لگتا ہے

عفت موہانی نے منظر نگاری بہت خوبصورت انداز میں کی ہے عفت موہانی کا دوسرا ناول ''محبت نام ہے غم کا'' کتابی شکل میں ۱۹۷۳ میں شائع ہوا۔ یہ ناول ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۷ میں ''حریم'' کے پرچوں میں چھپا۔ڈاکٹر فیصل کا بیٹا نافذ حسین نمائش میں کھو جاتا ہے اور لا ولد نواب صاحب کو ملتا ہے۔ انہوں نے پڑھا لکھا کر لکچرر بنایا شادی بھی کرتے ہیں اور ایک بچہ بھی تولد ہوتا ہے۔ کالج میں ٹینس مقابلے میں نافذ اپنے بہن بھائی اور ماں باپ سے ملاقات بھی ہوتی ہے اور وہ ایک قلبی ربط محسوس کرتے ہیں اور گھر آتے ہیں۔نافذ حسین کے بیٹے کو دیکھ کر مسز فیصل کو وہ اپنے بیٹا جیسا لگتا ہے۔نواب صاحب بھی ساری کہانی سناتے ہیں کہیں نافذ سے جدا نہ ہو جاں یہ سوچ کر غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں اور ایک اتفاقی حادثہ میں اپنی جان کھو دیتے ہیں جیتے جی نافذ سے جدائی برداشت نہ ہوئی۔نافذ کی محبت غم بن گئی تھی۔محبت نام ہے غم کا۔

عفت موہانی خواتین کی آزادانہ روش اور بے راہ روی کے سخت خلاف ہے۔

''ایک چراغ دور کا'' کی ہیروئن امیر ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد جو دولت چمک دمک سے ایک طوائف کے ہتھے چڑھی۔اشفاق کے ذریعہ اسے گذری زندگی سے چھٹکارا تو ملتا ہے مگر وہ بھی سماج کے ڈر سے عزت کی زندگی نہ دے سکا۔

طوائف اردو ادب کے ناول نگاروں کا ایک اہم موضوع رہی ہے عفت موہانی نے بھی اپنے ناولوں میں طوائف کے مختلف یہ پہلو دکھائے ہیں۔ مختلف قسم کے طوائفوں پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے اپنے کرداروں میں جو کہ طوائف پر مشتمل ہیں۔ان کے منفی اور مثبت پہلو بھی دکھائے ہیں اور انہوں نے ان کرداروں کے کالے سفید رنگوں سے اپنے ناول کے کینوس کو سجایا بھی ہے۔

''**دلدل کا کنول**''، ''**ہار جیت**'' اور ''**پت جھڑ کی بہار**'' کی کہانیاں طوائفوں کے گرد گھومتی ہیں ان ناول کے جو مرکزی کردار ہیں یعنی ناول کی ہیروئن طوائف ہے۔

ناول ''**مداوا**''، چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھنے والی ایک عورت کا قصہ ہے۔ جس کا نام محسنہ ہے وہ ایثار نامی خوبصورت لڑکے کی گفتگو خوبصورتی سے متاثر ہو کے اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اپنے ماں باپ کے منع کرنے پر بھی باز نہیں آتی۔عشق جب انسان کے دماغ کو چڑھتا ہے تو انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہی مثال اس ناول میں ہمارے سامنے آتی ہے جو وہ سمجھتی نہیں ہے۔اور پھر آخر میں اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

ناول ''**خمیازہ**''، ہمیں شہلا اپنے عیش کی خاطر آشنا کے تعاون سے اپنے شوہر کا قتل کر کے پھر آشنا سے شادی کر لیتی ہے۔

ناول ''**خواب وسراب**'' کی ماں جہاں آراء نے شہر یار کو اپنے سگے بیٹے کی طرح چاہا اور شہر یار کی خاطر سگے بیٹے کو چھوڑ دیا انسانی فطرت کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔کہیں ایک عورت ماں بن کر سگے کو سوتیلا کر دیتی ہے اور کہیں سوتیلوں کو سینے سے لگا لیتی ہے۔عفت موہانی کے فکشن میں تانیثیت نمایاں ہے۔وہ عورت کے مختلف رنگوں، مختلف حیثیتوں کی بات کرتی ہیں۔عفت موہانی کے کئی ناولوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ جیسے کنٹری وغیرہ اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کے بعض ناولوں پر ایوارڈ دیئے ہیں۔

ستم کے سہارے

،**محبت نام غم کا**

،ہمسفر

،درد و درماں

،غم گسار

،صنم

،قافلے بہار کے

،بزدل

،راز

،نام تمنا

،پندار

،آخری تحفہ

،محبت کی راہیں

،داغ دل شہر آرزو

،آہوں کے گیت

،مداو

،سچے بندھن

،سزا

،سویرے

، پیاں

،بھنور

،شہر آرزو

،آہوں کے گیت

، مداوا

،سچے بندھن

،دل کا کنول

،سویرے

بھنور

،لے نام بھی آہستہ

،فاصلے اور منزل

،درد کا رشتہ

،ایک چراغ دور کا

،صہبا

،زود پشیماں

،پھول کا دل

،شرارت

،وفا کا دکھ

،ہم تو جیئے بس تیرے لئے

،تقدیر

،پرائیا آگ

،بہانے

،انتظار

,ایک زخم نہاں اور

,آگ میں پھول

،تیرے جہاں سے چل دے

،پت جھڑ کی بہار

،آرزو کی سوغات

،نغمہ سنگ

،دوراہا

،خواب وسراب

،پیاسی برسات

،قلزم غم

،خلش

،تکریم

،پچھتاوے

،درد آشنا

،ایک نظر

،آفریں

،چبھن

،شرط

،تشنہ کام

،خواب، پریشان

،موم کی زنجیریں

،ہار جیت

،بے زبان

گناہگار

،نقاب

،تاوان

،محبت تم سے کی میں نے

،بنیا

،صنوبیہ

،تعبیر

،راستہ پھولوں بھرا

،خمیازہ

،اگر تم باوفا ہوتے

،صبح بہاراں

،سراب ساحل

،خواب ناتمام

،کرنوں کی مہک

،ماریہ

،وفا جن سے کی

عفت موہانی 2005 میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

کنول بہزاد

کنول بہزاد آٹھ اکتوبر کو پیدا ہوئی۔ وہ لاہور میں مقیم ہیں۔ کنول بہزاد ایک علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ معاشیات میں ماسٹرز اور ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں۔ انہوں نے کم عمری سے ہی لکھنے کا آغاز کیا اور بچوں کے لیے کہانیاں لکھی۔

کالج کے زمانے سے انہوں نے افسانہ نگاری شروع کی اور ان کے افسانے پاکستان کے معروف ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کا ناول ''نینتیر ے انجان" نہ صرف مقبول ہوا بلکہ اس پر تحقیقی کام بھی ہوا اور اسے ایوارڈ بھی ملا۔ وہ 18 سال تک بطور ماہرِ تعلیم خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔

کنول بہزاد بچوں کے ادب میں نمایاں خدمات پر کئی ایوارڈز حاصل کر چکی ہیں، اور قومی و بین الاقوامی سطح پر کہانی سنانے کے کامیاب سیشنز بھی کر چکی ہیں۔ اس وقت وہ اردو ورشہ ویب سائٹ پر سینئر ایڈیٹر (بچوں کا ادب)، تخیل فاؤنڈیشن کی ڈائریکٹر اور نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور میں سینئر کوآرڈینیٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ناول ''**نین تیرے انجان**'' رومانوی ناول نہیں ہے۔ یہ ایک معاشرتی ناول ہے۔ پنجاب کے دیہات سے ابھرتی یہ کہانی پاکستان کے دل تک پہنچتی ہے۔

ناول کا ہیرو شہریار جنوبی پنجاب کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتا ہے اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ میٹرک میں ضلع بھر میں پہلی پوزیشن لے کر مزید حصول تعلیم کے لیے لاہور چلا گیا۔

وہاں سبین نامی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے لگا تو بات محبت تک بڑھ گئی۔ مگر سبین کی منگنی اپنے خالہ زاد سے ہوگئی۔ جو بعد ازاں ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ دوسری طرف، گاؤں میں شہریار کی ماموں زاد، پروا اسے چاہتی تھی مگر شہریار نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ پروا کے بھائی ایاز نے اپنی بیوی کے دباو میں آکر اپنی معصوم بہن کی شادی اپنے بدقماش سالے سے شادی کروادی مگر پروا کم عمری میں زچگی کے دوران جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ادھر کئی برسوں بعد شہریار اور سبین کی اچانک ملاقات ہوئی اور پھر دونوں نے شادی کر لی۔

شہر لاہور کی محبت لکھنے والی کے قلم سے یوں ٹپکتی ہے۔ جیسے رس گلے سے شیرہ ٹپکتا ہے۔ بندہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

ناول سے اقتباس:

’’ وہ شہر اس کے لیے پریوں کے دیس جیسا تھا۔‘‘

’’وہ محبت کی دیو مالائی کہانیوں کا شہر تھا۔"

،’’وہ شہر پھولوں اور باغوں کا شہر تھا جن کی خوشبوں سے فضائیں معطر رہتی تھیں اور سب سے بڑھ کر وہ درسگاہوں کا شہر تھا۔ درسگاہیں جو عبادت گاہوں کی طرح مقدس ہوتی ہیں۔"

کنول بہزاد نے اپنے تاریخی شہر سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی درسگاہوں اور اساتذہ کرام سے عقیدت کا وہ دور یاد کرا دیا جب اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کو بازار میں دیکھتے ہیں تو ان کو سلام کی خاطر ایک پاؤں میں چپل پہنتے ہیں اور سعادت مندی میں پہل کرنے کی وجہ سے دوسرے پاؤں میں چپل پہننا بھول جاتے ہیں۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جس میں سمجھا جاتا تھا۔ استاد باغبانِ ریاضِ نجات ہے۔

کہانی ایک سیلف میڈ لڑکے کی جدو جہد کی کہانی ہے جو اپنے ایک پڑھے لکھے چچا کو رول ماڈل بناتا ہے۔ ناول میں پدرسری نظام کے ڈھانچے کی کئی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ صنفی امتیاز کس طرح پروا جیسی نرم و نازک لڑکی کو اپنی بھینٹ چڑھاتا ہے۔

ان کے ناول کی ایک اور خوبی ہے یہ قاری کو بھول بھلیوں میں نہیں ڈالتا۔ بجھارتوں اور پہیلیوں کی مشکلات میں مبتلا نہیں کرتا۔ فکشن کے باوجود اس میں افسانوی صداقتیں ہیں۔ دھیمے دھیمے دکھوں کی حرارت ہے۔ جذبات کی آنچ پر پکتی ہوئی یہ کہانی ماڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ روایتی بھی ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس ناول کے صفحات پلٹتے ہوئے کبھی کبھی آنکھیں فرط جذبات سے نم ہو جاتی ہیں۔

کنول بہزاد کے اسلوب میں سلاست اور روانی ہے بلکہ کنول بہزاد کی نثر سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ ناول مختلف رشتوں میں گندھا ہوا ہے۔ جس میں والد اور بیٹے کی محبت، استاد اور شاگرد کی محبت، پھپھو اور بھتیجی کی محبت، اک شوہر اور اس کی مرحوم محبوب بیوی کے پیار کی کہانی اس میں خالہ اور بھانجی کے رشتے میں

الفت پھر چچا اور بھتیجے اور اسی طرح یہ محبت کی بیل پھیلتے پھیلتے اتنی بار آور ہو جاتی ہے کہ اس پر اپنے لوگوں سے بھلائی کے خوشنما پھول کھلنے لگتے ہیں۔ کردار جیتے جاگتے ہیں۔ واقعات مربوط ہیں۔ پلاٹ سادہ اور منظّم ہے۔ مکالمے دلچسپ اور چستہ ہیں۔

ناول کی دو لائینیں:

''پروا، میلے میں بھیڑ ہوتی ہے، اکثر بچے گم ہو جاتے ہیں تو اپنی پھوپھی کی انگلی نہ چھوڑنا۔''

تین کردار منفی ہیں جو کافی پاورفل ہیں مگر ان میں سے بھی ایک دوبارہ انسان بنتا نظر آتا ہے۔

منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ناول میں پیش کی گئی ہیں تمصیل نگاری کو بھی مدنظر رکھتا گیا ہے۔

آسمان پر پھیلتی شفق کی لالی، ڈوبتا سورج، ایک درخت کی ٹہنی پہ بیٹھی تنہا چڑیا، شام کا دبے پاؤں گزرنا، دن کے اجالے کو اپنے آنچل میں سمیٹنا، فضا میں خنکی اور اداسی کا گھلا ہونا۔

''تمہارے اندر جو تخلیقی جوہر ہے، اسے زنگ آلود نہ ہونے دینا۔۔۔ویسے بھی کونپلیں تو سنگلاخ زمین سے بھی پھوٹ پڑتی ہیں۔''

ناول کے اختتام پر ناول نگار کا کہنا کہ

'' مٹی کا تم پہ حق ہے اگر تم تن آور درخت بن جاتے ہو تو اپنے ہم وطنوں کے لیے راستے ہموار کرو۔ انسان ہو تو اپنے وسائل معاشرتی آسودگیوں کے لیے تقسیم کر دو۔"

یہ ایک بڑا پیغام ہے اور ہر سماج کو اس کی ضرورت ہے۔ کنول بہزاد نے اس کا کینوس آفاقی کر دیا۔ کنول بہزاد نے ناول کو اپنی امی اور بیٹی کے نام انتساب کیا ہے۔ ناول کا مجموعی پیغام زندگی محبت اور امید ہے۔ ناول خوب سے خوب تر کی تلاش میں بڑھتا قدم ہے۔ ناول کنول کے دل کی آواز ہے۔ جس میں احساس کی لطافت، درد کی لذت اور غموں کی تفسیر پنہاں ہے۔

☆☆☆☆

نثار عزیز بٹ

نثار عزیز بٹ 1927 میں مردان میں پیدا ہوئیں۔ میٹرک میں صوبہ بھر میں اول آئیں تو اعلی تعلیم کے لیے اپنے بھائی سرتاج عزیز کے ہمراہ لاہور آ گئیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لے لیا۔ شعبہ ریاضی میں ماسٹرز کیا اور امتحان میں اول آئیں۔

نثار عزیز بٹ نے لکھنا کالج کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف میں 4 ناول ''نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے، کاروان وجود اور دریا کے سنگ'' شامل ہے۔ جبکہ سوانح عمری ''گئے دنوں کا سراغ'' نے بھی کافی شہرت پائی۔

وہ 2020 میں وفات پا گئیں۔

☆☆☆☆

نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر والدہ قرۃ لعین حیدر ہیں ۔آپ بیگم سجاد حیدر یلدرم ہیں ۔آپ 1894 میں پیدا ہوئی ۔ آپ کا نام نذر زہرا تھا۔شادی کے بعد نذر سجاد حیدر ہوگئی ۔ادب اطفال سے آپ نے لکھنے کا آغاز کیا۔ آپ کے ناولوں کا مجموعہ **''ہوائے چمن میں نغمہ گل''** ان کی بیٹی قرۃ لعین حیدر نے مرتب کر کے شائع کرایا۔اس میں سات ناول شامل ہیں ۔ان ناولوں میں **''اختر النساء،آہ مظلوماں ،حرماں نصیب ،ثریا ، جاں باز، نجمہ اور مذہب اور عشق''** ہے۔

پہلا ناول **اختر النساء** ایک تعلیم یافتہ ہنر مند لڑکی کا قصہ ہے۔جس نے سوتیلی ماں کی وجہ سے سخت اذیتیں اٹھائی لیکن اپنی روشن خیالی سے تمام مشکلات پر قابو پالیا۔

ناول سے اقتباس:

''کبھی آگے نہ بڑھو گے جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما جن کی گود تمام اقوام کا ابتدای اسکول ہے۔چشمہ علم سے سیراب نہ کریں گے۔کیوں کہ تمام نیک کاموں اور تمام درجات ترقی کی بنیاد علم ہے۔''

نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا موضوع ارد گرد کے معاشرتی مسائل ہیں ۔مثلاًتعلیم نسواں کی ضرورت ،بہن بھائی کی عظیم محبت، کثرت ازواج کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل اور نقصانات ، اولاد کی تعلیم و تربیت، بین مذاہب شادیاں اور وطن پرستی۔

نذر سجاد حیدر سے قبل متعدد خواتین نے معاشرے کی اصلاح کے لیے قلم اٹھایا۔اس دور میں خواتین کو تعلیم حاصل کرنے اور لکھنے کی اجازت نہیں تھی ۔نذر سجاد حیدر نے ایسے موضوعات پر لکھا جن سے خواتین کی

زندگی میں تبدیلی آسکے۔ ان کا ہر ناول خواتین کو پیغام دے رہا ہے کہ یہ وقت گھروں میں بند رہ کر زندگی گذرانے کا نہیں بلکہ معاشرے میں اپنے مقام کے ساتھ کچھ کر دکھانے کا ہے۔

آپ تقسیم ہندوستان کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ جن میں قرۃ العین حیدر ان کا اکلوتا بھائی اور دیگر رشتہ دار شامل تھے، پاکستان ہجرت کر گئی۔ آپ کچھ عرصہ انگلستان میں بھی رہیں اور 60 کی دہائی میں آپ اور آپ کی بیٹی قرۃ العین حیدر واپس ہندوستان چلی گئی اور وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ علالت کے بعد 1967 میں بمبئی میں انتقال کر گئی۔

☆☆☆☆

قراۃ العین حیدر

لکھاری، روشن دماغ اور قابل والدین کی اولاد خواتین ناول نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھنے والی قلمکار قراۃ العین حیدر ہیں۔ جو اردو فکشن میں عظیم الشان حیثیت کی حامل خاتون ہیں۔ ان کی شہرت زیادہ تر اس نئی تکنیک کے سبب ہے۔ جسے شعور کی رو کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے اردو ادب میں اس تکنیک کے استعمال کا عمدہ نمونہ نہیں ملتا۔ ان کا ادبی کارنامہ تقریبا چھ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہیں۔ ان کا ادبی کینوس نہایت وسیع ہے۔ یہی نہیں ان کے موضوعات کے دائرے میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے ناول اور افسانوں میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اور نفسیاتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ یوں تو ان کے سبھی ناول اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے مقبول و معروف ناولوں کی فہرست میں **''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینہ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''کارجہاں دراز ہے''، ''گردش رنگ چمن''** اور **''چاندنی بیگم''** شامل ہیں۔

ان کا ناول آگ کا دریا 1959 میں آیا۔ جب پاکستان اور ہندوستان تقسیم کے زخموں سے چور چور تھے۔ یہ ناول فکری تہذیبی اور تاریخی سفر ہے۔ جو نہ صرف اس دور کے دکھوں کو بیان کرتا ہے بلکہ ہزاروں سال پر محیط تاریخ کو بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ یہ ناول دراصل ایک تہذیبی داستان ہے۔ جس میں قدیم ہندوستان سے لے کر جدید دور تک کے حالات واقعات اور انسانی جذبات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خاصیت اس کا غیر روایتی سٹرکچر ہے۔ یہ کوئی سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ مختلف ادوار میں بکھری ہوئی ایک فکری اور علامتی داستان ہے۔ ناول کو چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے نمبر

پر قدیم ہندوستان جو کہ قبل از مسیح کا بتایا گیا ہے یہاں ہمیں گوتم جیسے کردار ملتے ہیں۔ جو فلسفہ روحانیت اور زندگی کے معنی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسرا دور مسلم دور حکومت ہے اس دور میں کمال الدین جیسے کردار سامنے آتے ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تیسرے نمبر پر برطانوی راج ہے۔ یہ دور مغربی اثرات، جدید تعلیم اور بدلتی ہوئی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

چوتھے نمبر پر تقسیم ہند کے بعد یہ حصہ سب سے زیادہ جذباتی اور دردناک ہے جہاں، شناخت، ہجرت اور بکھرا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ کردار مختلف ادوار میں بار بار ظاہر ہوتے ہیں جیسے گوتم، کمال ، چمپا، ہریش وغیرہ

یہ کردار دراصل انسانی فطرت، جذبات اور تہذیب کے تسلسل کی علامت ہیں۔ یہ ہمیں پیغام دیتے ہیں کہ وقت بدلتا رہتا ہے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن انسان کی بنیادی نیچر اور جذبات ہمیشہ ایک جیسے رہتے ہیں۔ ناول کا سب سے اہم موضوع انسانی شناخت ہے کیا ہماری پہچان مذہب سے بنتی ہے قوم سے یا ہماری تاریخ سے یہ سوال ناول کے ہر دور میں بار بار اٹھایا گیا ہے۔ ناول ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ تہذیبیں کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' بنگلہ دیش کے تاریخی واقعات کا فرضی کرداروں کے ساتھ پیش کردہ بیانیہ ہے یہ ناول مشہور دہشت پسند بنگالی تنظیم کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول پر ان کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

(آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے۔)

اس ناول کے کردار انقلابی اور باغی روش پر چلتے چلتے مفاہمت کا رستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ناول کے کرداروں کی باہمی کشمکش ردعمل کی صورت سامنے آتی ہے۔ یہ کل 46 ابواب پر مشتمل ناول ہے۔

یہ ناول 1979 میں چھپا۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں اوما دیوی، دیپالی سرکار، ریحان الدین،

روزی، جہاں آرا، یاسمین، ناصرہ، پادری بندجی، نواب قمر الزماں چودھری، وغیرہ۔ دیپالی سرکار انقلاب کے لیے خاندانی ورثہ پر مشتمل تین ساڑھیاں خیرات کر دیتی ہے۔ ریحان الدین مکار اور موقع پرست کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ریحان الدین سے تین عورتیں محبت کرتی ہیں۔ اوما دیوی جو کہ بظاہر خوبصورت عورت نہیں ہے۔ دیپالی سرکار جو بہت خوبصورت ہے۔ یاسمین جو ریحان الدین احمد کی منگیتر ہے۔

ناول سے اقتباس:

''لاکھوں برسوں سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع۔''

انہوں نے اپنے ناولوں میں عورت کے کئی روپ دکھائے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ایک مقام پر یوں رقم طراز ہیں کہ:

''ازل سے اب تک عورت ہی وہ مخلوق ہے جس کی قسمت میں ساری بدنصیبیاں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ عورت ہی ہے جو ساری عمر مرد کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے بعد بھی ٹھکرا دی جاتی ہے۔ کبھی مرد اسے شوہر کے روپ میں ٹھکرا دیتا ہے۔ کبھی بیٹا ماں کے روپ میں، محبوب محبوبہ کے روپ میں۔ لیکن عورت اس کے باوجود ان تمام مختلف رویوں سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو اپنی بے چارگی، اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کا رونا رونے کے لیے گرجا گھروں، مندروں، استھانوں، درگاہوں، اور مزاروں میں جاتی ہے، اور اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہیں۔''

انہیں اپنے ناولوں میں چاندنی بیگم ناول بہت زیادہ پسند تھا۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری'' کار جہاں دراز ہے'' کہ نام سے لکھی جو کہ تین جلدوں میں شائع ہوئی ان کی سوانح عمری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قرۃ العین حیدر 60 کی دہائی میں انگلستان چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان منتقل ہو گئی اور اپنی وفات جو کہ 2007 میں ہوئی تب تک اپ ہندوستان میں ہی مقیم رہیں۔

☆☆☆☆

واجدہ تبسم

واجدہ تبسم 1935 میں ہندوستان کے شہر امراوتی، مہاراشٹر میں پیدا ہوئی۔ وہ بارہ برس کی تھی کہ تقسیم ہندوستان کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے نتیجے میں ان کا خاندان جوان کے نانی اور نانا پر مشتمل تھا۔ ہجرت کر کے حیدرآباد دکن میں جا کر آباد ہو گیا۔ امراوتی سے حیدرآباد دکن تک کا سفر انہوں نے 13 دن میں طے کیا۔ اسی ہجرت کے نتیجے میں ان کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی اور ان کی حیدرآباد کی زندگی کے ابتدائی چند سال بہت زیادہ کسمپرسی میں گزرے۔ واجدہ تبسم تین برس کی تھیں تو یتیم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی اور ان کے باقی بہن بھائیوں کے پرورش ان کی نانی نانا نے کی۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل۔ ان کی بیشتر تحریریں حیدرآباد کے ماحول اور اردو کی دکنی بولی پر مبنی ہیں۔ جس پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ان کی کئی کہانیاں اس خطے کی پرانی اشرافیہ (نوابوں) کی عیش و عشرت بھری زندگی پر تنقید کرتی ہیں۔

انہوں نے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف 1960 میں اپنے کزن اشفاق سے شادی کی۔ بعد ازاں یہ جوڑا ممبئی میں مقیم رہا۔ واجدہ تبسم ایک پختہ عقیدہ رکھنے والی خاتون تھیں اور ان کا ماننا تھا کہ ان کی تحریر کی طاقت ایک روحانی اور مذہبی قوت سے آتی ہے۔

تبسم نے اپنے ناول ''نتھ کی عزت'' اور ''کیسے کاٹوں رین اندھیری'' کے ذریعے تانیثی فکر و شعور، احساسات و جذبات اور خاص کر مردانہ بالادستی کو جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ ناول ''نتھ کی عزت'' کی کہانی ایک نواب اور طوائف کے گرد گھومتی ہے۔ شوکت یار جنگ ایک نواب ہے۔ جو حیا نامی طوائف کی زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں اور وہ حیا سے شادی کا وعدہ کرتے ہیں لیکن وہ حیا کے ساتھ ایک رات گزارنے کے بعد اور اس کی

قربت سے تسکین حاصل کرنے کے بعد اپنے وعدے سے پھر جاتے ہیں۔اسی رات کی نشانی ایک بیٹی کی شکل میں حیا کی گود میں آتی ہے۔اس کے بعد نواب صاحب اپنی والدہ کے کہنے پر خاندان میں شادی کر لیتے ہیں۔ حیا کا دل ٹوٹ جاتا ہے وہ ایک دن بچی لے کر شہر چھوڑ جاتی ہے۔ شومئی قسمت سے اس کے بیٹی فوت ہو جاتی ہے۔وہ تنہا رہ جاتی ہے۔حیا کے شہر چھوڑ جانے کے غم میں اس کی ماں چل بستی ہے۔سازندے کوٹھا چھوڑ جاتے ہیں اور کوٹھا ویران ہو جاتا ہے۔نواب شوکت یار جنگ کے ہاں ایک بیٹا جنم لیتا ہے۔ جس کا نام وہ سرفراز سطوت رکھتے ہیں۔وقت گزرتا جاتا ہے نواب سرفراز 18 سال کا ہو جاتا ہے لیکن اس کا انداز تخاطب، نشست و برخاست لڑکیوں جیسا ہے۔کیونکہ سرفراز کے بعد نواب کے گھر مسلسل پانچ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ نواب کو فکر پڑ جاتی ہے کہ کہیں اس کا بیٹا نامرد تو نہیں ہے۔ویٹ ڈاکٹر کے مشورے کے ساتھ بیٹے کو رنڈی کے کوٹے پر بھیجنے کا سوچتا ہے اور جس رنڈی کے کوٹے پر وہ بیٹے کو بھیجتا ہے۔وہ حیا طوائف کا کوٹھا ہے۔ حیا شہر میں واپس آ جاتی ہے۔نواب کا بیٹا اس پر فدا ہو جاتا ہے اور اسے شادی کرنے کی ضد کرتا ہے۔اکلوتے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر نواب شادی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ ناول کا اختتامیہ بہت پرسوز ہے۔حیا طوائف نواب کے سامنے آتی ہے۔نواب کو اپنی محبت کی کہانی سناتی ہے اور خنجر سے خودکشی کر لیتی ہے۔

ناول سے اقتباس

''تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میں نے سبز جوڑا پہنا تھا۔آج بھی میں نے سبز کپڑے ہی پہن رکھے ہیں۔یادوں کی پروائی چلتی ہے۔تو کیسے کیسے پھول کھلاتی چلتی ہے۔ایک ایک کر کے ہر بات یاد آتی ہے۔آج ہی نہیں روز ہی یاد کیا ہے میں نے ان حسین ساعتوں کو (یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی)اگر مسلمان نہ ہوتی اور دوسرے تیسرے جنم پر ایمان اور اعتبار ہوتا تو خدا سے دعا کرتی کہ اے مالک انسان کا جنم دے۔نہ پرند چرند کا جنم دیجیو۔ تواب کے مٹی کا جنم دیجیو کہ سدا تمہارے قدموں تلے بچھی رہوں۔تمہارے پیروں سے چمٹی رہوں_ میں نے اس جسم کا جو صرف تمہاری ہی امانت تھا اور تمہاری ہی امانت رہا ہر ہر خیانت سے بچایا ایک بار صرف ایک بار تمہارے بیٹے نے شدت جذبات سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ ہاتھ میرے جسم کے لیے حرام ٹھہرا

تم گواہ رہنا۔ اوراس نے بجلی کی کسی تیزی کے ساتھ اپنی کمر میں اڑسا ہوا ایک چھوٹا سا خنجر نکالا اور کلائی کے پاس سے پنجے کو گاجر کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ پھر اسی پھرتی سے خنجر سے اس نے اپنے دل کے پاس ایک گہرا شگاف لگا لیا۔ خون کا فوارہ سا اچھلا۔ مگر وہ تیورا کر گری اور کراہی ''خودکشی کا گناہ ساتھ لے جا رہی ہوں مجھے چھوڑ کر میرے گناہوں میں مزید بوجھ نہ بڑھا۔''

''نتھ کا زخم'' نامی ناول کہانی کی شکل میں ماہنامہ شمع میں کئی برس پہلے وہ امریکہ کے نام سے چھپا۔ جب واجدہ تبسم صاحبہ 1972 میں امریکہ گئیں۔ تو وہاں ان کی ملاقات حیدرآباد دکن کے مشہور نواب کی بیٹی رفیقہ بانو سے ہوئی۔ جو کہ امریکہ میں رافقہ کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ اسی رفیقہ بانو سے واجدہ تبسم صاحبہ کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ خود بچی تھی۔ کم سن بچی، جبکہ رفیقہ بانو اس وقت جوان تھی۔ رفیقہ بانو نے اپنی کہانی واجدہ تبسم صاحبہ کو سنائی۔ اسی درد بھری کہانی پر مشتمل یہ ناول ''نتھ کا زخم'' ہے۔

ناول کی کہانی کے مطابق نواب سکندر یار جنگ کی بیٹی رفیقہ بانو ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ رفیق بانو کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا۔ جب وہ چند برس کی تھیں رفیقہ بانو کا چھ برس کی عمر میں نکاح کر دیا گیا۔ 1947 کے بعد حالات یک دم بدل گئے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد نوابوں پر تو گویا آفت ہی ٹوٹ پڑی۔ نواب صاحب نواب سکندر یار جنگ بھی ان حالات کی وجہ سے اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ وفات پا گئے۔ ان کے وفات پانے کے بعد ان کے محل پر چوروں اور ڈاکوں نے ہلا بول دیا۔ جس کے ہاتھ جو چیز لگی۔ لے اڑا۔ رفیقہ بانو کو ان کی بوڑھی دادی اپنے ساتھ لے گئی اور ان کی رخصتی کر دی۔ رفیقہ بانو کے شوہر امریکہ میں تھے رفیقہ بانو بھی تنہا امریکہ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ اور اپنے شوہر کے پاس امریکہ پہنچ گئی۔ جن سے بچپن میں ان کا نکاح ہوا تھا۔ لیکن وہاں اپنے شوہر کا چال چلن دیکھ کے وہ بہت حیران ہوئی ان کا ان کا شوہر ایک لالچی، مکار، سازشی، احسان فراموش نوجوان تھا جس کا نام احسان تھا۔ وہ رفیقہ بانو کو اپنی جائیداد سمجھتا تھا اور رفیقہ بانو سے زرخرید غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ دیگر ناولوں کی طرح اس ناول کا انجام بھی بہت دردناک ہے۔ رفیقہ اپنے شوہر احسان پر حملہ کر دیتی ہے۔ مسلسل قینچی اس کے پیٹ میں مارتی ہے۔ احسان کے پیٹ سے خون کے

فوارے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کا بیٹا عرفان تیز تیز رونے لگتا ہے۔احسان مر جاتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو دلاور (پرانا ملازم) کے حوالے کر دیتی ہے۔ جس کا تعلق ان کے علاقے سے ہے۔رفیقہ بانو کو جیل ہو جاتی ہے۔ 20 سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔رفیقہ بانو سے ملنے ایک لمبا گورا شخص آتا ہےاور رفیقہ بانو کے ہاتھ میں چند سکے رکھ دیتا ہے رفیقہ کو قید سے رہائی مل جاتی ہےاور باہر نکل کے ایک ٹیکسی کرتی ہے۔ وہ امریکہ سے میں ہندوستان حیدر آباد دکن پہنچ جاتی ہے۔ وہ ٹرین سے اترتی ہے۔رکشے میں بیٹھتی ہے۔

ناول سے اقتباس:

’’رکشے والے سے کہتی ہے "بھائی خانہ باغ لے چلو۔ چار مینار کے قریب ہے۔

رکشہ والا:’’ بڑی اماں اب وہ باتاں خواباں ہوگئیں۔ خانہ باغ بولے تو کوئی نہیں پہچاننے والا، خانہ باغ اجڑ کو گیا۔میں پرانا آدمی ہوں۔بول کے سمجھ گیا کوئی نوا ہوتا تو پہچانتا بھی نئیں تھا۔ اب انے کھنڈر رہے۔کھنڈر۔گر چلو آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔‘‘

ناول سے ایک اور اقتباس

’’میں چھوٹی سی تھی لیکن دادی اماں وہ منظر مجھے نہیں بھولتا۔ جب میری شادی کے سمے میرے ناک میں سونے کی وزنی نتھ ڈالی گئی تھی اور میں تکلیف سے چیخنے لگی تھی تو آپ نے میرے ناک کو دیکھا۔ نتھ کے وزن نے زخم سا کر دیا تھا۔ آپ ہنس رہی تھیں۔ ایوماں یہ نتھ وزنی اچ رہتی جی۔‘‘

اتنے اتنے میں رفیقہ کا بیٹا عرفان بھی آ جاتا ہے۔اور رفیقہ نیچے گرتی ہے اور جان دے دیتی ہے۔ اسے اپنے اس ملک کی مٹی نصیب ہو جاتی ہے جس سے اسے شدید محبت تھی۔

اپنی کتاب ’’شجر ممنوع‘‘ کہ شروع میں میری کہانی کے عنوان کے تحت واجدہ تبسم لکھتی ہیں:

’’ میرا گھرانہ سیدوں کا وہ گھرانہ تھا جہاں لڑکیوں کی کسی قسم کے آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔والدین کے گزر جانے کے بعد نانی اماں سے بڑی منتیں کی۔ یوں سکول میں داخلہ مل گیا۔‘‘

واجدہ تبسم لکھتی ہیں:

''شجر ممنوع میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے، سب سے زیادہ قریب رہے۔ یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔کالے بادل لکھتے سمے میں جس کرب اور امتحان سے گزری۔ اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیر چیز ہے مگر پھر بھی اس کو سجدے کیے جاتے ہیں۔''

واجدہ تبسم نے حیدرآباد دکن کی مسلم تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں پوشیدہ عورت کی بے بسی ،لاچاری،مظلومی،محکومی،اس کی حیثیت اور مجبوریوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔واجدہ تبسم کے ناولوں میں طوائفوں کی زندگی بھی اہم جزو رہی ہے۔اسی طرح ثروت خاں کا پہلا ناول اندھیرا پگ، تانیثی حسیت میں اہم مقام رکھتا ہے۔جس میں انھوں نے راجستھانی سماج میں بیوہ عورتوں کی حیثیت ومقام کو پیش کیا ہے۔اسی طرح واجدہ تبسم میں بھی حیدرآباد دکن کی تہذیب روایات سماج ماحول رسوم ورواج کو اپنی تحریروں اور فکشن کے ذریعے سے محفوظ کر دیا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے ان حقیقتوں کو سامنے لا کھڑا کیا جو اب تک پوشیدہ تھیں۔انہوں نے جس طرح حیدرآباد دکن کی تاریخ کو 1947 کے واقعات کے تناظر میں اور بعد کے حالات جو وہاں کے نوابانہ طرز زندگی میں پیش آئے۔جو تبدیلیاں ہوئیں اور جس طرح سے ایک دم سماج کی روایات بدل گئیں۔ان سب کو انہوں نے اپنے فکشن میں جگہ دی ہے اور ان کی تحریروں کے ذریعے قیمتی تہذیبی سرمایہ ادب میں محفوظ ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''شجر ممنوع'' کے نام سے لکھی ہے۔ اردو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ واجدہ تبسم سات دسمبر 2011 کو بمبئی ہندوستان میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

وحیدہ نسیم

وحیدہ نسیم نو ستمبر 1927 کو اورنگ آباد، حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں اور ہجرت کر کے کراچی آ بسیں۔ ان کے نانا اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوری مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے عثمانیہ گرلز کالج حیدر آباد دکن سے 1951 میں ایم ایس سی کیا اور 1952 میں پاکستان منتقل ہو گئیں۔ نباتیات ان کا مضمون تھا اور وہ اسی کی تدریس سے وابستہ رہی تھیں۔ وہ 1987 میں کراچی کے ایک کالج سے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

وحیدہ نسیم کا شمار ملک کی ان قابل فخر خواتین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے قلم اپنی زبان اور اپنے عمل سے پختہ ذہنوں کی تربیت کو اپنا اہم مقصد بنا لیا۔ آپ نے جو کچھ لکھا نوجوان نسل کے اصلاح اور تربیت کے لیے لکھا سر زمین دکن سے آپ کو والہانہ عشق تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہ۔ یہ آپ کے اجداد کی زمین تھی۔ یہیں سے آپ کے علمی ادبی ذوق کو جلا ملی۔ سرزمین دکن کی حسین یادوں اور تہذیب کو انھوں نے عمر بھر سینے سے لگائے رکھا۔ حیدر آباد دکن اپنی مخصوص تہذیبی قدروں کے معاملے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ناول غم دل کہا نہ جائے، حیدر آباد دکن کی اسی مخصوص تہذیب کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ذہن پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ تجسس اور سسپنس نے اس ناول کو غیر معمولی طور پر دلچسپ بنا دیا ہے۔ ہر ہر صفحہ پر قاری کے کرب اور بے چینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ بے چینی ناول کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔ غم دل کہا نہ جائے ایک سماجی اور اصلاحی ناول ہے۔ ناول کا آغاز ایک وضعدار بزرگ کلیم حسین سے ہوتا ہے۔ جو کہ محکمہ آثار قدیمہ میں ملازم ہیں۔ شریف اور خاندانی آدمی ہیں۔ ناول کے آغاز میں کلیم حسین، نواب جمشید کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ جو کہ اودھ کے بہت بڑے نواب ہیں۔ دکن کی کشش نواب کو حیدر آباد دکن کھینچ لائی تھی۔ کلیم حسین نواب کے گائیڈ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ناول کے دیگر کردار خاص طور پر نسوانی کردار بہت

اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ عورتیں جو جمشید کی ہوس اور حرص اور ظلم کا شکار بنی۔ جن میں کچھ کو نواب جمشید نے قتل کر دیا۔ مرکزی کردار جس نے مشرقی دیوی بن کر نواب کی جفاں پر صبر کیا۔ جس کی جائیداد پر نواب نے قبضہ کر لیا اور اسے قید کی زندگی دی۔ اس کردار کا قد اس قدر بلند ہے کہ اس کے سامنے باقی سب کردار ہیچ نظر آتے ہیں۔ اس سماج میں آج بھی ایسے کردار موجود ہیں۔ جو خاندانی وقار کی خاطر سارا جیون قید میں گزار دیتے ہیں۔

یہ قید خانہ انہیں نواب جمشید جیسے لالچی، کینہ پرور، حاسد، عیاش اور مکروہ ذہنیت والے شوہر دیتے ہیں۔ رنگیلا نواب جمشید دولت کی خاطر محبت کے نئے نئے سوانگ بھرتا رہا۔ اس نے ہر قدم پر فریب دیے ہر گام پر اداکاری کی۔ لیکن تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ کیونکہ یہی رکھ رکھا اس وقت کے معاشرے کی جان تھا۔ یہ کہانی ایک معذور اور مجبور کی عورت تھی جس نے اول سے آخر تک اپنا ایک ہی رول برقرار رکھا۔ جس نے زہر کو زہر سمجھ کر پیا، جس نے فریب کو قریب جان کر کھایا۔ جس نے اپنے لغت سے رقابت کا لفظ نکال کر نسوانیت کے خاکے میں نیا رنگ بھرا، کیونکہ یہی معیارِ انسانیت اس کے گھرانے کی آن تھی۔ اس نے دوسروں کے دل میں احساس کی چنگاریاں بھرنے کے لیے خود کو پتھر کی بے حس مورتی بنا کر پیش کیا۔ دوسروں کو شکست سے بچانے کے لیے خود شکست کھاتی رہی۔

ناول سے ایک اقتباس:

”مجھے دولت کی نہیں شرافت کی تلاش ہے۔ اگر مجھے کوئی نیک شریف گھرانہ مل جائے تو پھر میرے راستے میں میرا خاندان، میرا رتبہ، میری دولت، کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں، لال ہمیشہ گودڑی ہی میں ہوتے ہیں۔“

ناول سے ایک اقتباس:

”مسعود گھر پہنچا۔ اس وقت شام ڈھل چکی تھی فضا میں مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹینوں کی ہلکی ہلکی بو پھیل رہی تھی۔ باورچی خانے کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں شفق کی سرخی کے ساتھ مل کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا زاہدہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ اور سعدیہ آٹا گوندھ رہی تھی۔

مسعود کی ماں جائے نماز پڑھ رہی تھی کہ اتنے میں مسعود نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔"

غم دل کہا نہ جائے کے اہم کرداروں میں ثریا ،صبیحہ، رمضو ،کلیم حسین ،نواب جمشید، نانی اماں ،بشیرن، فرزانہ،عفت،شاہدہ، سلمی ،فریدہ اور خیراتن وغیرہ وغیرہ ہیں۔

وحیدہ نسیم نے اپنی ملازمت کے ساتھ تخلیقی سفر اور ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ شاعرہ ، ناول و افسانہ نگار اور محقق بھی تھیں۔انھوں نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ وہ ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔انھیں شاعرہ کی حیثیت سے مقبولیت ملی جب کہ ان کے افسانے بھی پسند کیے گئے۔انہوں نے اورنگ آباد پر کئی کتب لکھی۔

ان کا ناول ''ساحل کی تمنا''ایک بہن کی قربانیوں کی داستان ہے۔ جس کی قدر اس کے بھائی اور سگی ماں تک نہیں کرتے۔اس ناول پر پی ٹی وی نے ڈرامہ سیریل بھی بنایا ہے۔ناول ''زخم حیات''خورشیدہ کی کہانی ہے۔ناول ''شبورانی''رومانوی ناول ہے۔

''درد نہ جانے کوئی''ایک عورت کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ان کے ناولوں میں ''غم دل کہا نہ جائے'' ،''ساحل کی تمنا''،''زخم حیات''،''ایک لڑکی''،''درد نہ جانے کوئی''،''شبورانی''وغیرہ شامل ہیں۔

آپ ستائیس اکتوبر 1996 کو کراچی میں وفات پا گئی۔

☆☆☆☆

سوانحی اشارات

خاندانی نام: نادیہ لودھی

تخلص: عنبر

والد: فاروق خان لودھی

والدہ: شمیم لودھی

بہن بھائی: ایک بہن ، دو بھائی

اولاد: الوینہ، حارث، ہادی، ولی

تاریخ پیدائش: 23 جولائی، 1980، اسلام آباد، پاکستان

تعلیم: میٹرک فضائیہ اسکول کورنگی کریک کراچی

ایم اے: پنجاب یونی ورسٹی لاہور

ملازمت: خبریں مانچسٹر یو کے 2016 تا حال

تصنیفات: شب غم کا جوش (کالمز)، تعاقب میں خواب (شاعری)، گمراہ اور دوسری کہانیاں، معاصر اردو شاعرات حصہ اول

زیر طبع کتب: خاک دان (ناول)، معاصر اردو شاعرات حصہ دوم، اے حقیقت منتظر (تصوف)

رہائش: پنجاب ہاسنگ سوسائٹی، راولپنڈی، پاکستان

تصنیفات

شب غم کا جوش

تعاقب میں خواب

گمراہ اور دوسری کہانیاں

معاصر اردو شاعرات حصہ اول

دہلی اور آگرہ کے لودھی سلاطین کی تاریخ

خاک دان

زیر طبع

معاصر اردو شاعرات حصہ دوم

اے حقیقت منتظر

9 780997 025491



نادیہ عنبر لودھی معاصر اردو ادب کی ایک سرگرم اور نامور محقق، نقاد اور کالم نگار ہیں۔ وہ (صنف / جینڈر) کے حوالے سے اپنے تحقیقی کام کے لیے جانی جاتی ہیں۔ وہ اردو زبان میں صنف نازک اور داستان / ناول کے مطالعہ کی ایک اہم شناور ہیں اور ان کی بصیرت انگیز تحریریں مختلف معتبر ادبی جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی نئی تصنیف "اردو کی خواتین ناول نگار "خواتین کے تحریر کردہ ناولوں کی تاریخ ان کے سماجی و ثقافتی پس منظر اور اردو ادبی روایت میں ان کے کردار کا ایک جامع اور تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔

قلم کتاب ای پبلشرز
واٹس ایپ نمبر 03010487501